تحقیق

وحدت الوجود والشہود

مع

حالات مصنف مولانا شیخ محمد تھانوی محدث

مرتبہ

ثناء الحق ایم۔ اے (علیگ)

ناشر

۱/۸

پاک اکیڈمی (۱۴۱/۱ وحید آباد) گولیمار کراچی

سال طباعت ۱۹۶۳ء

بار اول ایک ہزار

مطبوعہ : — ایجوکیشنل پریس کراچی

فہرست مضامین

مقدمہ

حضرت مولانا شیخ محمدؒ تھانوی جن کا ایک مختصر رسالہ مع حالات زندگی مصنف علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں میرے پر نانا تھے۔ بچپن سے حضرت موصوف کا ذکر اپنی والدہ سے سنا کرتا تھا۔ پھر کہیں کہیں کتابوں میں بھی یہ نام نظر سے گذرنے لگا۔ دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس اجل ہستی کے جو جامع شریعت و طریقت تھی تفصیلی حالات کہیں ملیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ تذکرہ نگاروں کی کوتاہ قلمی کے سبب بہت کم حالات یکجا ہوئے ہیں تلاش و جستجو کے دوران تھوڑا سا ذکر رسالہ عطاء المنان میں ملا اس نے آتش شوق کو اور بھڑکا دیا۔ ۱۹۵۷ء میں دیوبند جانے کا اتفاق ہوا۔ دار العلوم کے کتب خانہ میں حضرت کی چند تصنیفات ارشاد محمدی، انوار محمدی اور مثنوی معنوی دفتر ہفتم نظر سے گذریں۔ کم فرصتی کی وجہ سے ان کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقعہ تو نہیں مل سکا۔ البتہ ان کے اقتباسات جن سے حضرت کے حالات اور ان کتابوں کے مضمون

پر روشنی پڑتی تھی لے لیے۔ اسی سفر سے واپسی کے وقت والد مرحوم مولوی عطاء الحق صاحب کے پاس سے حضرت مولانا کی قلمی بیاض بھی ساتھ لیتا آیا اور اس کا خورد بینی جائزہ لیا۔ بحمد اللہ اس سے مجھے بہت سے حالات معلوم ہوئے اسی بیاض میں آپ کا ایک فارسی رسالہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی دقیق بحث پر نظر آیا۔ یہ اگرچہ مطبع نیرو ز بجنور میں کبھی طبع ہو چکا ہے لیکن اب نایاب ہے اس لیے خواہش ہوئی کہ اسے دوبارہ طبع و شائع کیا جائے۔

میرے عزیز دوست جناب محمد ایوب قادری اس امر کے محرک ہوئے کہ میں پہلے حضرت مولانا کے مختصر حالات جو مجھے اس وقت تک دستیاب ہوئے تھے یکجا کر کے کسی رسالہ میں شائع کرا دوں بعدہٗ جب تفصیلی حالات مل جائیں تو ان کو رسالہ مذکور کے ساتھ شامل کر کے کتابی شکل میں شائع کرا دوں۔ رائے کے صائب ہونے میں تو کوئی شک نہیں تھا لیکن میں اپنی بے بضاعتی کا احساس کرتے ہوئے ان دونوں حکموں کی تعمیل سے ہچکچاتا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے محترم دوست ان دونوں کاموں کو مجھ سے کہیں بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے تھے۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ وہی ان حالات کو ترتیب دیں لیکن انہوں نے مجھے بتایا کہ "حضرت مولانا تمہارے بزرگ تھے اس لئے تم پر ہی اپنے ان بزرگ محترم کے حالات زندگی لکھنے کا فریضہ عاید ہوتا ہے"۔
بات معقول اور دلیل قوی تھی۔ فوراً سمجھ میں آ گئی اور میں ان

دونوں ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ وقتاً فوقتاً جو کتابیں ملتی رہیں ان سے مواد جمع کرکے ایک مختصر سے مضمون کی شکل میں ترتیب دیا اور العلم کے شمارہ جولائی تا ستمبر ۱۹۵۶ء میں شائع کرادیا۔

یہ مضمون لکھنے کے بعد پھر میرا کوتاہ خامہ رک کر رہ گیا لیکن میرے دوست قادری صاحب مجھے کب بخشنے والے تھے انہوں نے اپنے اصرار کو جاری رکھا اور مجھے اس کام کو انجام دینے کے لئے تیار کرلیا۔ انھوں نے مجھے اس راہ پُر خار میں بھٹکنے کے لئے تنہا نہیں چھوڑ دیا بلکہ وہ اول سے آخر تک میری رہبری کرتے رہے جہاں سے بھی ممکن ہوا مواد فراہم کرکے مجھے دیا اور اس طرح میرے راستہ کو دقتوں اور دشواریوں سے صاف کیا۔

جس طرح تحریری مواد کا سب سے بڑا ذریعہ قادری صاحب بنے اسی طرح زبانی روایتیں تمام تر مجھے اپنے خالو قاضی محمد مکرم صاحب مائل تھانوی سے جن کا مرتبہ اردو فارسی نظم و نثر میں نہایت بلند ہے اور جو تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں حاصل ہوئیں۔ یہ روایتیں میرے ان محترم بزرگ کو حافظ ضامن شہید کے خلف ارشد حافظ محمد یوسف صاحب مرحوم سے اور ایک اور بزرگ بخشی محمد حسن صاحب مرحوم سے پہنچی تھیں۔ اس مواد کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حافظ محمد یوسف اور بخشی محمد حسن دونوں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں از اول تا آخر شریک رہے اور تمام واقعات ان

کی آنکھوں کے سامنے گزرے۔

ان دو بڑے ذرائع کے علاوہ جن کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے بعض اور کتابیں بھی میرے پیش نظر رہیں لیکن یہاں ان سب کے نام ایک ایک کرکے گنانا مشکل ہے[1] تاہم یہ اعتراف میرے لئے ناگزیر ہے کہ اگر ان کتابوں سے مجھے استفادہ کا موقع نہ ملتا تو اس تحریر میں یقیناً خاصی تشنگی رہ جاتی۔

اس تمام مواد میں جس سے مجھے مدد ملی دو حضرات کی بعض عبارتیں تکلیف دہ ہیں ایک صاحب تذکرۃ الرشید مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کی دوسری مولانا عبید اللہ سندھی کی دونوں نے معمولی سے نظری اختلاف کی وجہ سے حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے کردار کو خاصا مجروح کیا ہے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اپنی گرانقدر تالیف تذکرۃ الرشید میں چند مقامات پر حضرت مولانا شیخ محمدؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا مناظرہ پیش کیا ہے اس موقع پر اگر وہ غیر جانبداری سے کام لیتے اور اس امر پر غور کرتے کہ مولانا شیخ محمدؒ عمر، علم اور تقویٰ ہر لحاظ سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے افضل تھے تو منطقی طور پر یہی نتیجہ نکلتا کہ مولانا رشید احمد گنگوہی کا بچپن اور ان کی کم سنی تھی کہ وہ جوانی کے جوش میں مولانا شیخ محمدؒ جیسی مقتدر ہستی کے مقابلہ میں میدان مناظرہ میں اترے۔ اس وقت ان کی حیثیت ایک فارغ التحصیل نوجوان سے زیادہ نہیں تھی عمر اور تجربہ کی کمی اور تحمل و ضبط کی عدم پختگی نمایاں تھی راہ طریقت میں بھی اس وقت تک قدم نہیں رکھا تھا۔ ان ہی سب باتوں کا

---

[1] تمام مآخذ کتابیات کے عنوان کے تحت آخر میں درج کر دیئے گئے ہیں۔

نتیجہ تھا کہ ان کی تحریر کا انداز جس کو مولانا عاشق الٰہی نے اپنے ممدوح کی خوبی بنا کر پیش کیا ہے اتنا سوقیانہ ہو گیا تھا۔ غور فرمائیے کہ ایک علمی مناظرہ میں یہ عامیانہ شعر تحریر فرما دیا ؎

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

کس قدر ناتجربہ کاری کی دلیل ہے ایک ایسے مسئلہ کے لئے جس میں خود مولانا رشید احمدؒ فریق مقابل کی حیثیت رکھتے تھے ان کا یہ فیصلہ کر دینا کہ

"مولانا! اس موقع پر آپ شکست کھا گئے مگر مولانا اثر ماننے کی ضرورت نہیں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔"

ان کی بزرگی اور تقدس و تقویٰ پر دلالت کرتا ہے یا جوان العمری کی غیر ذمہ دارانہ اور غیر دانشمندانہ حرکات کو واضح کرتا ہے۔

دوسری جگہ جہاں حضرت مولانا شیخ محمدؒ کا ذکر آیا ہے وہ مجلس شوریٰ کا موقع ہے جو جنگ سے پہلے قصبہ تھانہ بھون میں منعقد ہوتی تھی۔ اس وقت بھی حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمدؒ کی رائے سے حضرت مولانا شیخ محمدؒ کو اختلاف تھا اس لئے صاحب تذکرۃ الرشید نے حضرت مولانا کی وزنی دلیلوں کو دیدہ و دانستہ چھوڑ دیا اور کچھ لوچ دلائل ان سے منسوب کر کے ان کو ایک ہٹ دھرم اور ناسمجھ ملا کی شکل میں پیش کر دیا۔

تیسرا مقام وہ ہے جہاں حضرت مولانا رشید احمدؒ کے تبحر علمی کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بالواسطہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ کو جاہل بتایا گیا ہے گویا اُس

متاع عزیز یعنی علم دین کو بھی ان سے چھیننے کی کوشش کی گئی ہے جس کی بدولت وہ اپنے زمانہ ہی میں نہیں بلکہ عصر مابعد میں بھی ایک نمایاں حیثیت کے مالک سمجھے جاتے رہے۔ تذکرۃ الرشید کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

> خود بندہ کو یہ واقعات پیش آئے ہیں کہ جناب حضرت حاجی صاحب اور حافظ صاحب جو پہلے سے مولوی شیخ محمد صاحب سے مسائل دریافت کر کر ان پر عامل تھے بندہ کے کہنے سے کتنے ہی مسائل کے تارک ہو گئے اور واللہ کہ حافظ صاحب نے یہ کلمہ میرے سامنے فرمایا کہ ہمکو بہت سے مسائل میں ہمیشہ دھوکا رہا ہے۔"

اس عبارت کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) مولانا رشید احمد کے بیعت کرنے سے پہلے حضرت حاجی امداد اللہ رح اور حضرت حافظ ضامن رح جو خود مسئلہ مسائل سے ناواقف تھے مولانا شیخ محمد رح سے مسئلے پوچھ پوچھ کر کام چلاتے تھے۔

(۲) مولانا رشید احمد رح کے بیعت کر لینے کے بعد ان دونوں حضرات نے سمجھ لیا کہ اب ایک بڑا عالم ہمیں مل گیا ہے لہذا مولانا شیخ محمد رح کو چھوڑ کر ان سے رجوع کرنے لگے۔

(۳) مولانا رشید احمد رح ان حضرات کو جو مسئلے بتاتے تھے وہ اکثر مولانا شیخ محمد رح کے بتائے ہوئے مسئلوں سے مختلف ہوتے تھے۔

(۴) حاجی صاحب رح اور حافظ صاحب رح چونکہ پہلے ہی مولانا رشید احمد رح

کی علمیت کا لوہا مان چکے تھے اس لئے بغیر یہ تحقیق کئے کہ ان دونوں علماء میں کس کی رائے صحیح اور کس کی رائے غلط ہے مولانا رشید احمدؒ کے بتائے ہوئے راستہ پر چل پڑتے تھے اور ساتھ ہی یہ اعتراف کرتے جاتے تھے کہ ابھی تک ہمیں دھوکا دیا جا تا رہا تھا اور ہم غلط راستہ پر چل رہے تھے۔ اب تم نے آکر ہمیں صحیح راستہ دکھایا۔

ایک طرف حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے علمی مرتبہ کا اندازہ کیجئے انہوں نے علوم حدیث و تفسیر و فقہ حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ سے پڑھ کر ان ہی سے سند فراغ حاصل کی تھی۔ پھر مکہ معظمہ کے دوران قیام میں حضرت مولانا شاہ محمد یعقوبؒ سے ان تمام علوم کی سند پائی تھی خود ان کے تبحر علمی کی بدولت علماء کی صف میں ان کو ایک نمایاں مقام حاصل رہا اور خاندان ولی اللہی کے اکابر کی طرح ان کے نام کے ساتھ بھی محدث کا لفظ ہر زمانہ میں آتا رہا۔ دوسری جانب مولانا رشید احمدؒ کی ذات ہے باقاعدہ طریقہ پر علم دین انہوں نے بھی حاصل کیا تھا۔ لیکن ان کو کبھی وہ درجہ نصیب نہیں ہوا جس پر مولانا شیخ محمدؒ فائز تھے۔ ایسی صورت میں حاجی صاحبؒ اور حافظ صاحبؒ کا اپنے ایک دوست، ہم عصر اور پیر بھائی کو جن کے علمی مرتبہ کو بھی وہ اچھی طرح سمجھتے تھے چھوڑ کر ایک کم عمر مرید کے کہنے پر کسی اور ذریعہ سے تحقیق کئے بغیر چلنے لگنا کیسے باور کیا جا سکتا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی اپنی تالیف "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے صفحہ ۱۲۰ پر تحریر فرماتے ہیں :-

"دوسری طرف خود شاہ اسحٰق کے اپنے گروہ میں ایک مخالف جماعت دہلی میں پیدا ہوگئی۔ مولٰنا نذیر حسین دہلوی اور مولٰنا شیخ محمد تھانوی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔"

اس عبارت کے ذیل میں جو حاشیہ دیا گیا ہے اس کی عبارت یہ ہے:
"شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جن کے مسلک پر مولانا اشرف علی صاحب کاربند ہیں اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط مانتے ہیں۔"
ضمیمہ جات میں جو نوٹ حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے متعلق دیا گیا ہے اس میں حکیم الامت حضرت مولٰنا اشرف علی تھانویؒ پر بھی رکیک حملہ کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو یہاں نقل کرتے ہوئے قلب کو اذیت ہوتی ہے۔

بہرکیف یہ سب الفاظ ایک خاص رجحان کے تحت لکھے گئے ہیں ورنہ کوئی ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ میاں نذیر حسین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہؒ کے مخالفین میں سے تھے۔ میاں نذیر حسین سے حضرت مولاناؒ کی واقفیت ضرور تھی لیکن ان سے کہیں زیادہ تعلقات حاجی امداد اللہؒ اور حافظ ضامن شہیدؒ سے تھے۔ اگر محض ذاتی واقفیت ہی سے کسی پارٹی سے متعلق ہونا متحقق ہوتا ہے تو پھر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ کا تعلق حضرت حاجی امداد اللہؒ کی جماعت سے بہت گہرا تھا۔ اس دعویٰ کے ساتھ یہ دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ جب تھانہ بھون میں مجلس شوریٰ

منعقد ہوئی تو حضرت مولانا کو بھی اس میں شریک کیا گیا۔ اگر حضرت حاجی امداد اللہ جانتے ہوتے کہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ میاں نذیر حسین کی جماعت کے رکن ہیں تو وہ انکو اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت کیوں محسوس کرتے۔"

دراصل حضرت مولانا شیخ محمدؒ کو کسی پارٹی سے متعلق گردانا ایک بڑی غلطی ہے۔ وہ کلیتاً ایک عالم دین اور ایک صوفی صافی بزرگ تھے انہیں سیاسی معاملات سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لئے وہ ان سے حتی الامکان علیحدہ رہے۔ مجلس شورہ میں ایک فقہی مسئلہ درپیش تھا اس لئے ان کی شرکت کو ناگزیر سمجھا گیا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کی بھی یہی روش تھی۔ وہ بھی سیاسی معاملے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ عمر بھر اشاعت دین اور رشد و ہدایت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ایسی صورت میں انہیں شیخ الہند کی جماعت کا مدمقابل ٹھہرانا قطعاً غلط ہے۔

غرض ان دونوں بزرگوں کی تحریروں میں یہ چند باتیں ایسی شامل ہوگئیں جو بے بنیاد ہونے کے ساتھ ساتھ غلط فہمیوں کا پیش خیمہ ہیں اور ان ہی کی وجہ سے حضرت مولانا کی عظیم شخصیت کی جانب بہت کم لوگوں نے توجہ کی بلکہ اکثر تذکرہ نگاروں نے یا تو آپ کے ذکر کو قلم انداز کر دیا۔ یا سرسری سا حوالہ دے کر ختم کر دیا اسی لئے یہاں ان باتوں کی نشاندہی کر دینا ضروری ہوا تاکہ آئندہ کے لئے ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے۔

شکوہ و شکایت کی اس قدرے طویل داستان کے بعد اب میں شکر و سپاس کے دائرہ میں قدم رکھتا ہوں۔

قاضی محمد مکرم صاحب مائلؔ تھانوی سے میرا جو تعلق ہے وہ پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ آج تک میں نہ ان کی بزرگانہ شفقتوں کا جو عمر بھر میرے حال پر رہیں کماحقہ اعتراف کر سکا اور نہ اب اس عنایت کا جو انہوں نے حضرت مولانا رح کے حالات کی ترتیب میں مدد دے کر فرمائی پورا پورا شکریہ ادا کرنے کا خود کو اہل سمجھتا ہوں۔ تاہم اگر وہ قبول فرمائیں تو ان کی خدمت میں بطریق نیازمندی نذر عقیدت پیش کرتا ہوں

صدیق مکرم جناب محمد ایوب قادری نے اس کتاب کی ترتیب میں جو حصہ لیا اس کی تفصیلات بتانے کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے شکریہ کے لئے مناسب الفاظ کہاں سے فراہم کروں وہ اس کام کی انجام دہی میں شریک غالب کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ حضرت مولانا کا جو فیض روحانی مجھے پہنچے گا اس میں بھی وہ شریک غالب ہی رہیں گے۔

اب میں مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کی خدمت میں اپنے جذبات کے نخل تازہ سے شکر و سپاس کے کچھ پھول اور شگوفے چن کر پیش کرتا ہوں۔ میں حقیقتاً "حکیم محمد عمر جیہ پھاولی کے مرتبہ "حالات محمدی" کے حصول میں قطعاً ناکام ہو چکا تھا اور حضرت مولانا شیخ محمد رح کے جس قدر حالات فراہم ہو گئے تھے ان ہی کو یکجا کر کے پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا

کہ یکایک ماہنامہ "تذکرہ" اپریل ۱۹۶۲ء دیوبند میں مولانا کے موصوف کا تفصیلی مضمون نظر سے گزرا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس مضمون کا ماخذ "حالات محمدی" مرتبہ حکیم محمد عمر چرتھاولی ہے۔ چونکہ اس مضمون میں کئی باتیں میرے لئے نئی تھیں اس لئے میں نے بلا تکلف ان کو اپنے یہاں شامل کر لیا۔ لیکن یہ جتا دینا ضروری ہے کہ میں نے کہیں بھی الفاظ میں تحریف اور تغیر و تبدل کر کے مضمون کو اپنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر جگہ کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ "یہ کلیاں کسی دوسرے چمن سے حاصل کی گئی ہیں۔"

میں محترم عبدالغفار خاں صاحب کی خدمت میں بھی ہدیہ تشکر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے نظریہ وحدت الوجود اور نظریہ وحدت الشہود کو سمجھانے کی کوشش کی۔

جناب عبدالحلیم صاحب چشتی جن کی مملوکہ کتاب ترجمہ حزب البحر (قلمی) سے میں نے استفادہ کیا، محترم اعجاز احمد صاحب علوی اور رفیق محترم وحید اللہ صاحب صدیقی بھی جن سے مجھے بعض کتابیں دستیاب ہوئیں میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ میں اس خوشگوار فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ اپنی اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔

ثناء الحق

۲ر نومبر ۱۹۶۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حالاتِ مصنف

وطن اور خاندان | تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر[1] (یوپی) کا ایک چھوٹا سا مگر مردم خیز قصبہ ہے۔ اسی قصبہ نے قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ، صاحب کشاف اصطلاحات الفنون، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت حافظ ضامن شہیدؒ، حضرت مولانا فتح محمد تھانویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو جنم دیا اور یہیں اس رسالہ کے مصنف حضرت مولانا شیخ محمد محدثؒ پیدا ہوئے جو جامع شریعت و طریقت تھے۔

حضرت مولاناؒ تھانہ بھون کے ایک ذی وجاہت فاروقی

---

[1] حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے زمانہ میں تھانہ بھون ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔

خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ کے والد ماجد مولانا حمد اللہ[1] رئیس شہر قاضی نجابت علی کے دوہرے داماد اور قاضی عنایت علی کے پھوپا تھے۔ باپ کی طرف سے حضرت مولانا کا شجرہ نسب ۳۴ واسطوں سے سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مل جاتا ہے[2] آپ کی والدہ مسماۃ بی صاحب بنت قاضی نجابت علی تھیں۔

پیدائش، تربیت اور والدین کے سایہ سے محرومی

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی ولادت ۲۰ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ مطابق ۲ مئی ۱۸۱۵ء کو پیر کے دن ہوئی۔

آپ کے والد مولوی حمد اللہ جن کے آپ تنہا صاحبزادے تھے تحصیلداری کے عہدہ پر فائز تھے۔ جدی املاک اور جائداد بھی کافی تھی اس لئے آپ کو آنکھ کھولتے ہی ہر طرح کی آسائش نصیب ہوئی لیکن ان آسائشوں اور ناز و نعم

---

[1] نزہت الخواطر جلد ۷ ص ۲۱۴ پر مولانا کے والد کا نام احمد اللہ تحریر ہے جو یقیناً غلط ہے

[2] پورا شجرہ نسب یہ ہے: مولانا شیخ محمدؒ بن مولوی حمد اللہ بن حکیم محمد بخش بن قاضی حکیم محمد ارحم بن حافظ محمد اعظم بن مکرم خان بن شیخ احمد عرف نواب فاروقی بن مولوی محمد صابر بن شیخ علی کلاں بن شیخ عبد اللہ بن شیخ سراج الدین بن قاضی چندن بن قاضی محمد موسیٰ بن قاضی نصر اللہ خان بن قاضی محمد یعقوب خان بن شیخ نظام الدین زخشی بن شیخ شہاب الدین بن محمد فرخ کرخی بن فرخ شاہ کابلی بن محمد شاہ کابلی بن نصیر الدین شاہ بن محمود شاہ بن مسعود شاہ بن شاہ عبد اللہ بن شاہ واعظ الاصغر بن شاہ واعظ الاکبر بن شاہ ابو الفتح بن شاہ محمد اسحٰق بن حضرت تاج الاولیا سلطان ابراہیم بن ادہم بلخیؒ بن سلیمان بن ناصر الدین بن حضرت عبد اللہ بن امیر المومنین حضرت عمر فاروق خلیفہ دوم۔

کے باوجود آپ کی تربیت کی جانب سے کبھی غفلت نہیں برتی گئی۔ بزرگوں کی توجہ اور اپنی پاک طینت کے سبب آپ شروع ہی سے نیکوکاری اور دینداری کی راہ پر گامزن رہے۔

بعض اور اکابر کی طرح آپ کو بھی نہایت کمسنی میں داغ یتیمی برداشت کرنا پڑا۔ پانچ برس کی عمر میں آغوش مادری چھٹا۔ دس سال کا سن نہیں ہوا تھا کہ سایہ پدری سے محرومی نصیب ہوئی۔ آپ کے لئے یہ دونوں صدمے نہایت جانکاہ وجاں گسل تھے۔ مزید والدین کا سایہ نہ رہنے سے آپ کی تعلیم وتربیت اور ترقی کے ذرائع بہ ظاہر منقطع ہو چکے تھے لیکن قدرت کا غیر محسوس ہاتھ جو کسی سبب اور ذریعہ کا محتاج نہیں اب بھی کشاں کشاں آپ کو بلند مقصد حیات کی طرف لے جا رہا تھا اور آپ کی فطرت سلیم جادۂ علم ومعرفت میں برابر آپ کے لئے شمع راہ ثابت ہو رہی تھی۔

ابتدائی تعلیم آپ کی تعلیم کا آغاز والدین کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ آپ کے پدر بزرگوار مولوی حمداللہ خود عالم اور علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے اپنے نور عین کی تعلیم کا نہایت معقول انتظام کیا۔ قدیم دستور کے مطابق چار پانچ سال کی عمر میں آپ کی تعلیم شروع ہوئی۔ حافظہ تیز اور ذہن رسا تھا استادوں کی توجہ اور شفقت نے مل کر ان پر اور جلا کی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑے عرصہ میں آپ کے جوہر ذاتی کھلنے لگے اور نہایت کمسنی میں آپ نے قرآن مجید مع تجوید حفظ

کرلیا۔ پھر فارسی پڑھی، بعدہٗ مولانا عبد الرحیم تھانوی اور مولانا قلندر بخش جلال آبادی سے عربی صرف و نحو کی تحصیل و تکمیل کی غرض دس گیارہ سال کے سن میں یہ سب مرحلے طے ہو گئے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم کا معمولی سا تذکرہ نزہتہ الخواطر جلد ہفتم صفحہ ۴۱۲ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حوالہ سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

وقراء علی مولانا عبد الرحیم تھانوی والشیخ قلندر بخش جلال آبادی

یہ دونوں بزرگ کون تھے اور ان کی علمیت کا کیا مرتبہ تھا ان باتوں کا کسی ذریعہ سے پتہ نہ چل سکا۔

دہلی کی حالت اور شاہ ولی اللہ کا اثر

حضرت مولانا کی طفلی کا دور ہند و پاکستان کی تاریخ کا وہ دور تھا جب سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا لیکن خود دہلی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنی ہوئی تھی وہاں ہر طرح کے صاحب کمال حضرات کا اجتماع تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے علم کی جو شمع روشن کی تھی اس کو آپ کے تین نامور صاحبزادوں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ۔ حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ اور ان کی اولاد و احفاد نیز شاگردان و مریدان با صفا نے مزید روشنی عطا فرمائی اور اس کے لمعات سے برصغیر کے تمام گوشوں کو منور کر دیا۔

اسی خانوادہ ولی اللٰہی سے دو ایسی مبارک ہستیوں نے جنم لیا جو علم سے زیادہ عمل کی جانب مائل ہوئیں اور جنہوں نے وہ تحریک چلائی جو خالصتاً اسلام اور مسلمانان ہند و پاکستان کے احیاء اور ترقی کے لئے تھی۔ ان میں ایک مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بن شاہ عبدالغنیؒ امام دلی اللہ کے پوتے تھے۔ دوسرے حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی شاہ علم اللہ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو حضرت شاہ عبدالعزیز محدثؒ سے شرف تلمذ و بیعت حاصل تھا ان دو بزرگ ہستیوں میں جوش جہاد اس قدر فزوں تھا کہ انھوں نے اپنی مقدس زندگیاں اسی کے لئے وقف کر دیں اور جانسپاری و جاں نثاری کے وہ نمونے چھوڑ گئے جو رہتی دنیا تک ان کے ناموں کو زندہ رکھیں گے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ نے جہاد سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے حکم سے شمالی ہند پاکستان کے مختلف شہروں اور قصبوں کا دورہ کر کے لوگوں سے جہاد کی بیعت لی اسی سلسلہ میں ان کا ورود مسعود تھانہ بھون میں بھی ہوا۔ اس وقت حضرت مولانا شیخ محمدؒ کا عہد طفلی تھا لیکن وہ دور ایسا تھا جب دینی حمیت مسلمانوں کے بچے بچے میں موجود تھی چنانچہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ حضرت مولاناؒ نے بھی سید صاحبؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی اس کا ذکر کئی جگہ نہایت والہانہ انداز میں کیا ہے اسی رسالہ کے خاتمہ میں مرقوم ہے۔

"وقطع از یں فقیر یاد دارد کہ عمرم ہفت سال باشد

خود در مسجد پھیرامحوالی، واقع وطن فقیر قصبہ تھانہ بھون ضلع سہارنپور از اضلاع میان دوآب بہ شرف بیعت از خدمت جناب سید صاحب ممدوح قدس سرہٗ مشرف شد اگرچہ در ایام طفلی بودم اما پرتو بزرگان کافی است و باز فیض روحی از دشاں می دارم۔"

ایک اور رسالہ ارشاد محمدی میں اسی واقعہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :-

" وجہ پیر صحبت معنوی بہ لسبدت حضرت سید صاحب قبلہ مصدر المناقب قدس سرہٗ یہ ہے کہ فقیر کو ابتداءً بعمر ہفت سالگی اول شرف بیعت اور حاضری یک دو بار حلقہ توجہ ہی حضرت سید صاحب ممدوح ہوا۔

تحصیل علم کی غرض سے دہلی کا سفر

حضرت سید احمد شہیدؒ کے دورہ کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ جن کو علوم دینیہ کی جانب پہلے ہی سے خاصی رغبت تھی اب اس جذبہ سے اور بھی سرشار ہو گئے ۱۰-۱۱ سال کی عمر تک تو وطن ہی میں رہ کر علم حاصل کیا لیکن جب اس سن کو پہنچے تو یہ دائرہ تنگ معلوم ہونے لگا اور اس چھوٹی سی عمر میں جب عام بچے گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں آپ حصول علم کے شوق میں تن تنہا دہلی پہنچ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ رہ گرائے عالم لقا

ہو چکے تھے اور ان کی مسند درس و تدریس کی زینت ان کے نواسے شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ تھے۔

حضرت مولاناؒ نے حضرت شاہ محمد اسحقؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا[1]۔ اور حصول علم کی جانب اس قدر توجہ مبذول کی کہ آٹھ سال کی مدت میں علوم متداولہ کی تحصیل کر کے اٹھارہ سال کے سن میں شاہ صاحب سے سند فراغ حاصل کی اور علم کی دولت سے مالا مال ہو کر اپنے وطن واپس آئے۔

۱۱۰۷۳

بالاکوٹ کا واقعہ اور حضرت شاہ محمد اسحٰق کا ہجرت فرمانا

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی دہلی سے واپسی کے ڈیڑھ سال پہلے (۶ مئی ۱۸۳۱ء کو) بالاکوٹ کا خونچکاں واقعہ رونما ہو چکا تھا

---

[1] نزہۃ الخواطر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مولانا نے علوم متعارفہ کی تحصیل شیخ مملوک علی نانوتوی سے اور منطق و حکمۃ کی تحصیل مولانا فضل حق خیرآبادی سے کی نزہت الخواطر کے الفاظ یہ ہیں:۔

ثم سار الی دهلی واخذ العلوم المتعارفة عن الشیخ المملوك العلی النانوتوی وقرأ المنطق والحکمة عن العلامة فضل حق بن فضل امام الخیرآبادی ثم لزم الشیخ اسحٰق بن افضل العمری الدهلوی واخذ عنه الحدیث۔

اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد ناکامی پر منتج ہو چکی تھی۔ اس واقعہ کے بعد ملک میں جو حالات رونما ہوئے ان سے قطع نظر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ جو اس تحریک کی قیادت فرما رہے تھے اس ناکامی سے اتنے برداشتہ خاطر ہوئے کہ ۱۲۵۶ھ ۱۸۴۰ء میں وہ اپنے برادر خورد حضرت شاہ محمد یعقوبؒ کے ہمراہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور اس تحریک کو چلانے کے لئے ایک بورڈ بنا گئے جس کی صدارت استاذ العصر مولانا مملوک علی کو سپرد کر دی گئی۔

دہلی سے واپسی کے بعد علمی سرگرمیاں

چونکہ مولانا محمد اللہ قصبہ کے ایک ذی حیثیت فرد تھے اور اتنی املاک و جائداد چھوڑ گئے تھے کہ اس سے بآسانی زندگی بسر کی جاسکتی تھی۔ اس لئے حضرت مولاناؒ کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد حصول معاش کی فکر نہیں کرنی پڑی اور آپ گھر پہ رہ کر اپنی علمی قابلیت بڑھانے لگے اپنے مکان کے متصل حوض والی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے وہیں طلباء کو درس دیتے اور اکثر و بیشتر عوام و خواص کو وعظ و پند سے مستفیض فرماتے۔[1] تصنیف و تالیف کا شوق شروع ہی سے تھا اس جانب بھی جلد ہی توجہ مبذول ہو گئی۔ غرض تھوڑے ہی عرصہ میں

---

[1] تذکرہ اپریل ۶۲ء

حضرت مولانا کی علمیت کا دور و نزدیک شہرہ ہوگیا۔ اور وہ ایک عالم دین کی حیثیت سے ہر جگہ متعارف ہوگئے۔

وطن میں حضرت مولانا کے جتنے دوست اور ملنے والے تھے ان میں حضرت حاجی امداد اللہؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔ دہلی میں آپ کے دوستوں اور مخلصوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ غالباً انھیں دوستوں کی کشش حضرت مولانا کو تحصیل علم کے بعد بھی اکثر دہلی تشریف لے جانے پر مجبور کرتی رہی اور اس مرکز علم و ادب سے آپ کے تعلقات ایسے وابستہ رہے کہ لوگ آپ کو دہلی کے طلباء مستعدین اور علماء دین میں شمار کرتے تھے ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء میں نواب صدیق حسن خاں بغرض حصول علم دہلی گئے تو اس وقت ان کی ملاقات جن حضرات سے ہوئی ان میں سے بعض کا ذکر مآثر صدیقی موسوم بہ سیرۃ والاجاہی حصہ دوم میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

"طلباء مستعدین میں مولوی شیخ فیض الحسن صاحب سہارنپوری ملا نواب صاحب مقیم مکہ معظمہ، و مولوی ارشاد حسین صاحب رام پوری، مولوی فضل رسول صاحب بدایونی، مولوی ثناء الدین صاحب و مولوی شیخ محمد صاحب تھانوی و مولوی فضل حق خیرآبادی کے ساتھ ربط ضبط رہا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد بھی حضرت مولانا کے تعلقات دہلی کے اہل علم حضرات سے قائم رہے اور آپ کا وہاں اکثر آنا جانا

ہوتا رہا۔

دہلی سے بھی بعض دوست بغرض ملاقات آئے ہوں گے۔ لیکن اس کا کوئی زبانی یا تحریری ثبوت دستیاب نہیں ہوا تاہم حکیم مومن خاں کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ حضرت مولانا ؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ ؒ سے ملاقات کی غرض سے کئی مرتبہ تھانہ بھون آئے اور حضرت حاجی صاحب ؒ کے مکان پر مقیم ہوئے۔[۱]

شریعت کا احترام اور طریقت کا معیار

وطن میں چند سال تک حضرت مولانا محض عالم دین کی حیثیت سے متعارف رہے۔ سوائے اس بیعت کے جو آپ نے اپنی سات سال کی عمر میں حضرت سید احمد شہید ؒ کے ہاتھ پر کی تھی اس وقت تک نہ آپ نے اور کسی سے بیعت کی اور نہ علم باطنی کی جانب مائل ہوئے درحقیقت بعض نام نہاد صوفیوں کو دیکھ کر آپ اس کوچہ میں آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ آپ کے دل میں شریعت کا احترام اتنا تھا کہ طریقت سے اس کو فروتر کہنے یا سننے پر کسی طرح آمادہ نہ تھے اور جب بعض متصوفین کو یہ کہتے سنتے کہ طریقت کے مقابلہ میں شریعت کیا چیز ہے یا طریقت اور شریعت کی راہیں جدا جدا ہیں تو آپ کے دل میں قدرتاً ان کے لئے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ راہ طریقت سے آپ گریزاں نہیں تھے لیکن اس کے لئے

---

[۱] یہ روایت قاضی محمد بکرم صاحب مائل تھانوی سے ہم تک پہنچی ہے۔

شریعت کو بنیاد بنانا ضروری قرار دیتے تھے۔ شرح حزب البحر میں ایک جگہ اپنے اسی عقیدہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :-

"...... ایسے جاہل فقیروں اور درویشوں سے جو شریعت اور طریقت کو مخالف تبلاتے ہیں دور بھاگنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ اُن کی صحبت میں بہ امید حصول عرفان اور وصل خداوندی کے اصل متاعِ ایمان جو باعثِ نجات اُخروی ہے ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ معاذ اللہ منہا......"

اسی احتیاط کا اقتضا تھا کہ آپ کسی پیر طریقت کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے سے ہچکچاتے رہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ جو آپ کے ہم جدّ[1] اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ جو آپ کے پھوپی زاد بھائی تھے۔ حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی قدس سرہٗ کے زمرۂ مریدین میں شامل ہو چکے تھے وہ دونوں ازراہ دوستی مصر ہوتے کہ "آپ بھی حضرت میانجیو سے بیعت ہو جائیے!" لیکن چونکہ حضرت مولانا کو میانجیو کی علم شریعت سے واقفیت پر پورا بھروسہ نہیں تھا اس لئے آپ دونوں دوستوں کے مشورہ کو ہنسی میں ٹالتے رہے بلکہ ایک دو مرتبہ حضرت میانجیو کی شان میں یہ الفاظ بھی کہہ گذرے۔

"واہ وا! اچھا پیر تلاش کیا۔ مسجد کا میاں جی۔ میں اس سے کیا بیعت ہوں گا، جس کو علم شریعت سے بھی پوری آگاہی نہیں"

---

[1] حضرت حاجی امداد اللہ کا شجرۂ نسب بارھویں پشت میں یعنی قاضی چندن پر حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے شجرہ سے مل جاتا ہے۔

یا وہ تو مسجد کے ملا ہیں۔ ان سے کیا بیعت کروں گا؟"

حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی رح سے بیعت

کچھ مدت اسی طرح گذر گئی اور حضرت مولانا
... طریقت میں قدم نہ رکھ سکے۔ آخر وہ وقت آ گیا جب پیر کامل کی نظر فیض اثر نے
... کی کیفیت قلب کو یکسر بدل دیا، اور آپ نے حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی
... کے ہاتھ پر چشتیہ صابریہ، نقشبندیہ اور قادریہ سلسلہ میں بیعت کر لی۔

... نسیم احمد جھنجھانوی اپنی مختصر تالیف "نور محمدی" میں حضرت مولانا شیخ محمد
... کے مرید ہونے کے واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی تو برادری کے بھائی تھے، مگر حضرت حافظ محمد ضامن صاحب تھانوی حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی ایک دوسرے کے حقیقی پھوپھی و ماموں زاد بھائی تھے اور یہ تینوں حضرات فاروقی تھے۔ جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب غیبی بشارت پا کر حضرت میاں جیو سے بیعت ہو گئے تو انہوں نے مولانا شیخ محمد صاحب کو بتلایا کہ میں لوہاری میں جو جھنجھانہ کے ایک میاں جیو نور محمد صاحب ہیں ان سے بیعت ہو گیا ہوں تم بھی ان سے بیعت ہو جاؤ۔ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب نے اپنے علم کی وجہ سے حضرت میاں جیو کی ایک قسم کی توہین کی کہ واہ وا! اچھا پیر تلاش کیا مسجد کا میاں جی!! یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حضرت میاں جیو

نور محمد رحمۃ اللہ علیہ اسی مسجد میں جس کو اب خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تشریف لائے حضرت حاجی صاحب نے مولانا شیخ محمد صاحب سے فرمایا کہ ہمارے شیخ آ گئے ہیں جو کچھ تم کو پوچھنا ہو پوچھ لو اور آئندہ حضرت شیخ کی برائی نہ کرنا ورنہ دوستی میں فرق آ جائیگا جس پر یہ دونوں حضرات میانجیو کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سورۂ رحمٰن کے متعلق سوال کیا حضرت میانجیو نے فرمایا:-

"میں تو مسجد کا میاں جی ہوں مجھے کیا خبر" مگر جب ان حضرات نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے شیخ محمد صاحب سے فرمایا:-

"آنکھیں بند کر کے پھر میری آنکھوں کی طرف دیکھو"

حضرت شیخ محمد نے جو ایک بار آنکھیں بند کر کے کھولیں اور حضرت میانجیو کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو حضرت کی آنکھوں میں ان کے سوال کا جواب لکھا ہوا تھا پھر حضرت میانجیو نے فرمایا:-

"دیوار کی طرف دیکھو" تو سوال کا جواب دیوار پر بھی لکھا ہوا پایا"

حضرت میانجیو کی اس کرامت کو دیکھکر حضرت مولانا نے فوراً بیعت کر لی۔ اس واقعہ کو نسیم احمد صاحب ایک اور طرح بھی بیان کرتے ہیں۔

"بعض لوگوں سے اس طرح سنا ہے کہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "وہ تو مسجد کے ملا ہیں" ایک جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے کہ حضرت میانجیو کی نظر ان (مولانا شیخ محمد) پر پڑی۔ مولانا تڑپ گئے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ لوگوں نے کہا "طبیب کو بلاؤ" ایک اہل دل اس مجمع میں

ہو بخفے۔ انہوں نے فرمایا۔ ان میاںجیو صاحب سے کہو یہ علاج کریں گے
ضرت سے درخواست کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ میں تو مسجد کا ملا ہوں میں
جانوں،، دوسروں کے اصرار پر حضرت میاںجیو نے پانی پڑھ کر دیا۔ ہوش
لیا، اور وہ قدموں پر گر پڑے۔ اور حضرت سے بیعت کی درخواست کی
ضرت نے بعد میں مرید فرمالیا"

بعض بزرگوں سے یہ روایت سنی ہے۔
"دو حاجی صاحبؒ اور حافظ صاحبؒ نے میاںجیو نور محمدؒ سے
بیعت ہونے کے بعد مولانا شیخ محمدؒ کو مشورہ دیا کہ وہ بھی
میاںجیو کے حلقہ ارادت میں داخل ہو جائیں۔ مولانا نے
"مسجد کے ملاّ کی پھبتی کہہ کر ان کے اس مشورہ کو ٹھکرا دیا
بعدہٗ تین روز تک خواب میں بشارت ہوئی تو مولانا مثنوی
معنوی کے چند اشعار کا مطلب میاںجیو صاحب سے
دریافت کرکے ان کی علمیت اور بزرگی کے قائل ہوئے
اور حلقہ مریدین میں داخل ہو گئے"

ان سب روایتوں میں جزوی اختلاف ہے۔ لیکن ہر ایک سے اس امر
کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت مولاناؒ طریقت کے لئے شریعت کو ضروری
خیال کرتے تھے اور ایک ایسے رہبر کے متلاشی تھے جو جامع شریعت و طریقت
ہو۔ جب حضرت میاںجیو کو بخوبی جانچ اور پرکھ لیا اور آپ پر یہ امر منکشف
ہو گیا کہ گو میاںجیو علوم شریعت سے بظاہر بہرہ وافی نہیں رکھتے تاہم

سلوک کی راہیں طے کرنے کے بعد ان کا سینہ ہر قسم کے علوم سے لئے خوب
کھل گیا ہے تو آپ نے بغیر توقف حضرت میاںجیو سے بیعت کر لی اور بہت
جلد خلیفہ مجاز کے درجہ پر فائز ہو گئے۔

بیعت کے بعد اپنے پیر بھائیوں سے تعلقات

حضرت مولانا شیخ
کو طریقہ نقشبندیہ
سے فطری لگاؤ تھا۔ چنانچہ آپ نے اس کی بہت جلد تکمیل کر لی۔ حضرت حاجی
امداد اللہؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کا رجحان طریقہ چشتیہ صابریہ کی
جانب زیادہ تھا۔ وہ دونوں اس طریقہ میں حضرت مولاناؒ سے گوئے سبقت
لے گئے۔ اپنے پیر و مرشد حضرت میاںجیوؒ سے فیض حاصل کرنے کے علاوہ یہ
تینوں پیر بھائی ایک دوسرے کو بھی فیض پہنچاتے تھے۔ حضرت مولانا نے
رسالہ ارشاد محمدی میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے۔

"اور ابتدا میں فقیر نے حسب ارشاد حضرت پیر و مرشد اصلی
میاں جی صاحب نور الاسلام کے اپنے پیر بھائی حضرت حافظ
ضامن علی شاہ صاحب تھانوی مرحوم و مغفور سے بھی کہ
مجھ سے پہلے مرید حضرت میاںجیو صاحب کے تھے قدرے
فیض صرف نسبت چشتیہ کا اٹھایا[1] علیٰ ہذا القیاس برادر دینی

لہ غالباً حضرت مولانا شیخ محمد کی اس عبارت سے ہی مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی
نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پہلے حضرت حافظ ضامن سے روحانی فیض حاصل کیا بعدہ براہ
راست حضرت میاںجیو سے بیعت ہوتے تھے۔

پیر بھائی میرے جناب حاجی امداداللہ شاہ صاحب تھانوی سلمہ اللہ تعالےٰ نے بھی ان سے فیض اٹھایا اور بعد تکمیل سندت نقشبندیہ محمد عاجز کے حضرت حافظ صاحب مرحوم نے بعض امور نقشبندیہ کو فقیر سے دریافت فرما کر کاربند ہوئے ۔۔۔"

حضرت میانجیو رح کی نگاہ میں حضرت مولانا شیخ محمد رح کا مرتبہ

حضرت مولانا علوم ظاہری میں میانجیو رح کے تمام مریدوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ بنابریں حضرت میانجیو رح آپ کا بیحد لحاظ کرتے تھے۔ ملاقات کے موقعہ پر گفتگو میں اور مراسلت کے وقت خطوط میں آپ کے علمی مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہی پیرایہ اختیار کرتے تھے جو آپ کے شایان شان ہوتا تھا حضرت میانجیو کے ایک خط کا ترجمہ کر کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مولانا[1] مولوی شیخ محمد صاحب فضیلت مآب کی خدمت گرامی میں ! اللہ تعالیٰ ان کے شوق و ذوق کو جو معرفت خداوندی میں ہے زیادہ کرے۔ سلام ہو آپ پر اور اس شخص پر جو ہدایت اختیار کرتا ہے۔ اس فضیلت مآب مولانا کا گلشن شباب طاعات ایزدی کی آبیاری سے سرسبز ہو۔ داعی کے

---

[1] نثر کا ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اشعار بجنسہ نقل کر دئے گئے ہیں۔

دل کا بلبل ہر طرح سے ملاقات کے پھول کے شوق میں مترنم و مشتاق ہے۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ ملاقات اوقات معینہ پر منحصر ہے۔ اپنے مقصد اصلی کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسے وقت ہیں کہ سقائے سحاب نے آلام روزگار کی لو میں کمھلائے ہوئے قلوب کو حیات تازہ بخشی اور نہروں اور حوضوں کے رہنے والوں کو پانی کی موجوں کی بہجت آفرینی نے مثل شب بیدار صوفیوں کے جو حلقہ عبادت ڈال کر معبود حقیقی کے قسم قسم کے اذکار و اشغال میں لگے ہوتے ہیں اور نواسنجان گلشن کو عروس بہار کی جلوہ گری سے بزم خرمی کے قوالوں کی طرح کھینچ کر انواع و اقسام کے دلفریب نغموں میں مشغول کیا ہے ؎

نبات از گوشہ خود سر بر آورد
بیاد تحفہ ایزد بار بر خورد
زہے موسم کہ در ہر کشت زارے
شدہ آب رواں چوں نو بہارے

نامہ مسرت کے انبساط انگیز مضمون کو دیکھ کر کہ اس کے ریحان الفاظ حسن و خوبی اور طرب ریزی کی وجہ سے نونہالان بوستان کی طرح ناز کرتے تھے چشم دل نے طراوت تر و تازہ اور تازگی بے اندازہ پائی ؎

صبا رسید و دلم غنچہ خنداں شد
شمیم لطفش درمانِ دردمنداں شد

اگرچہ پیمانۂ دل اس کی ارتیاح آیات کے بادۂ مکالمات سے خرم و شاد ہوا لیکن عارضِ حال نے خوش آئندہ قانون کی نوازش یعنی ظاہری گفتگو کے بغیر جو منتہیٔ جان ہے اطمینان کلی نہ پایا۔ اللہ تعالےٰ جو جامع المتفرقین ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کی طرح زلال وصال کے متمنیوں کو ان کی مراد تک پہنچائے۔ اس استعداد و شوق کی وجہ سے جو جسمانی معانقہ و مصافحہ میسر نہ آنے کے سبب شدت اختیار کر گیا ہے۔ سورج کی تیز شعاعیں نوکِ قلم پر آکر اپنا اظہار کر رہی ہیں۔ مولانا غور کیجئے کہ پروانہ دیدارِ جمالِ شمع کے شوق میں پریشان رہتا ہے اور اس کی حرارت سے پرہیز نہیں کرتا جس وقت بلبل کو گلزار کے حسن دلنواز کے دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے تکلیف سے نہیں ڈرتا۔ پس اس صورت میں کہ ایسی مخلوقات کا یہ طریقہ و ردیہ ہو بنی نوعِ انسان کا کیا ذکر جس کی پیدائش و خلقت نے تخمِ دوستی و محبت میں نشو و نما پائی ہے حاصل کلام یہ کہ تمام امور میں غمخواری اور محبت کی ضرورت ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

رسالہ گل لالہ تصنیف کردہ اس مجمع کمالات کا (یعنی مولانا

شیخ محمدؒ کا) جو معارف ربانیہ کا پہچاننے والا اور حقائق کا تحقیق کرنے والا ہے۔ فن تصوف میں ہے اور اس کا نام تنقیۃ[1] لاعتقاد و تصفیۃ الفواد من الکفر و الارتداد ہے میں اس کو دیکھنے کا بیحد شائق ہوں۔ وہ دن کتنا اچھا ہوگا جب اس کے مشتاقان جمال کی آنکھیں اس کے مطالعہ کے کحل الجواہر سے روشن و منور ہوں گی۔

اس کے علاوہ مہربان مخلص دل حافظ جیو صاحب، حافظ ضامن علی کو اپنے پال گوپال کی جگہ سمجھ کر اس کے حال پر شفقت و مہربانی کی نظر رکھیں۔ اگر اتفاقاً بہ تقاضائے بشریت ان سے کوئی لغزش ہو تو سوائے معافی اور مہربانی کے وجہ ضمیر (ضمیر کے چہرہ) پر کوئی نقش نہ رہے۔ دل کی کدورت اور رنجش جسمانی کو ان اوراد و اشغال سے جو آپ کو بتلائے گئے ہیں صیقل توجہ سے پاک و صاف کر کے غیبی مہمانوں کے اترنے کی جگہ بنائیں (دل کو گرد کدورت سے صاف رکھیں) سے

۱ؔ غالباً حضرت مولاناؒ نے اس نام کا بھی کوئی رسالہ فن تصوف پر لکھا تھا۔ لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا اس لئے آپ کی تصانیف کی فہرست میں اس کو شامل نہیں کیا گیا۔

دلت چو غنچہ بذکرش شگفتہ سر بادا
لبش بہ شبنم یادش چو برگ تر بادا
مشامِ جانِ من از کوئے او شمی باید
وجودِ نخلِ ز عشقش تو بارور بادا

زیادہ بجز شوق کیا لکھا جائے۔ حافظ جیو صاحب، حاجی امداد اللہ صاحب و حافظ رفیع الدین صاحب اور مسجد کے اردگرد رہنے والے جملہ حضرات کو سلام مسنون الاسلام پہنچادیں اور بندہ کے پاس اس وقت جو لوگ حاضر ہیں ان میں سے حافظ محمود نانوتوی عفی عنہ کی جانب سے مولوی صاحب، حافظ محمد ضامن صاحب اور حافظ امداد اللہ صاحب کو بصد نیاز وانکسار آداب و تسلیمات پہنچے۔

حضرت میانجیو کا فیضِ روحانی اور وصال

حضرت مولانا کو اپنے پیر طریقت حضرت میانجیو نور محمدؒ کی صحبت بہت کم نصیب ہوئی لیکن بمصداق "امارت و بزرگاں کافی است" پیر کی نظر فیض اثر اس پر حضرت مولانا کی ذاتی صلاحیت دونوں نے مل کر چند ہی سال میں آپ کو کندن بنادیا۔

۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں حضرت میانجیو نور محمدؒ کا بعمر ۵ سال وصال ہوگیا اور یہ تینوں پیر بھائی مسند ارشاد پر بیٹھے اور اپنے پیر تو انوار سے ایک عالم کو منور کرنے لگے۔

سفر حرمین الشریفین اور شاہ محمد یعقوب سے اخذ فیض

حضرت میاںجیو کے وصال کے تقریباً چار سال بعد حضرت مولانا نے براہ[1] ٹونک حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ مکۂ معظمہ کے دوران قیام میں حضرت شاہ محمد اسحٰق[2] کے برادرِ خورد حضرت شاہ محمد یعقوب سے صحاح ستہ، تفسیر، فقہ وغیرہ کی سند حاصل کی اور ان تمام اشغال و اذکار کی اجازت پائی جو شاہ صاحب کو اپنے نانا حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہٗ سے پہنچے تھے۔ حضرت مولانا ارشادِ محمدی کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> ۱۲۶۳ھ میں فقیر کو بعد شرف بیعت وصحبت اپنے بمقام مکہ معظمہ شرفہا اللہ تعالےٰ حضرت مولانا مولوی محمد یعقوب مہاجر مکیؒ، نواسہ اور خلیفہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ نے اجازت عام اذکار و اشغال و اعمال جملہ ان طریقوں کے جو ان کو حضرت شاہ عبد العزیز محدث

---

[1] نواب وزیر الدولہ نے احادیث تہذیب الاخلاق کی تالیف وتدوین کے لئے آپ کو بلایا تھا۔ آپ مکہ معظمہ جاتے ہوئے ٹونک تشریف لے گئے اور اس کام کو مکمل کرکے اسی سال حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ [2] حضرت شاہ محمد اسحٰق کا انتقال ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں ہوگیا تھا اور اس وقت حضرت شاہ محمد یعقوب حیات تھے۔ اس لئے حضرت مولانا نے ظاہری اور باطنی علوم میں ان ہی سے فیض حاصل کیا۔

قدس سرہٗ سے پہنچے تھے مع خرقہ کرتہ شریف اپنے کے ومعہ
سند مہری علم حدیث صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث اور
علم تفسیر وفقہ واصول حدیث اور تصوف باوجود حصول
سند علم موصوفہ فقیر کو بیشتر پیش گاہ حضرت استاد مولانا
شیخ المشائخ آفاق مولانا مولوی محمد اسحٰق محدث مہاجر مکی
شاہ جہان آبادی قدس سرہٗ سے جو برادر حقیقی کلاں
ان کے ہیں عطا فرمائے اور بعد توجہ دہی یہ بھی فرمایا کہ
اللہ اکبر تمہاری نسبت میں بڑی فراخی اور وسعت ہے
اور تم کو اب کچھ احتیاج اکتساب باقی نہیں رہی اور ہم میں اور
تمہارے پیر و مرشد اصلی میں یعنی مولانا نور الاسلام حضرت
میانجیو نور محمد جھنجھانوی میں کسی طرح کا تفاوت نہیں!!

اسی سفر سعید میں حضرت مولانا کو مسئلہ وحدت الوجود والشہود کے بارے میں بعض مکاشفات ہوئے جن کو آپ نے ایک رسالہ کی شکل میں مرتب کر کے اپنی قلمی بیاض میں درج فرمایا۔ اس رسالہ کا نام پرانے عربی ناموں کے انداز پر "رسالہ الہامات الوجود الودود فی تحقیق وحدۃ الوجود والشہود" رکھا۔ یہ وہی رسالہ ہے جو اس وقت ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے[1]

حج سے واپسی کے موقع پر حضرت مولانا فرقہ شاذلیہ کے سرخیل

---

[1] یہ رسالہ ایک مرتبہ پہلے بھی طبع ہو چکا ہے۔ مگر اب بالکل نایاب ہے۔

حضرت امام ابوالحسن شاذلی یمنی کے مزار واقع مخا[1] (یمن) پر تشریف لے گئے۔ شرح حزب البحر کی تمہید میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمائے ہیں:-

"فقیر نے وقت واپسی کے حرمین شریفین سے ۱۲۶۳ھ بارہ سو تریسٹھ ہجری علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ان کے مرقد منور کی زیارت کی"

بمبئی پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے امام فخر الدین رازی کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے۔ آپ نے اس کو پڑھا تو بیحد متاسف ہوئے۔ اور دہلی پہنچنے سے پہلے اس کے جواب میں ایک کتاب تیار کرلی جس کا نام "مناظرہ محمدیہ" رکھا۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے اس کو بہت پسند کیا اور اس پر تقریظ لکھی۔

حج سے واپسی کے بعد

سفر حج سے وطن واپس آئے تو آپ نے پیر محمد والی مسجد میں رہنا اختیار کیا۔ وہیں حاجی امداد اللہؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کا قیام تھا۔ ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہونے کی وجہ سے اور اس لئے کہ مختلف مشائخ مثلاً حضرت محمد اعلیٰ تھانوی صاحب کشاف اصطلاحات الفنون اور حضرت مفتی الٰہی بخشؒ مصنف مثنوی تکملۂ فرششم نے یہیں باطنی فیوض حاصل کئے تھے یہ مسجد "دوکان معرفت" کہلاتی تھی۔

---

[1] مخا یا موخا یمن کا مشہور شہر ہے۔ وہاں کا قہوہ بہترین سمجھا جاتا ہے۔

یہاں دن رات علم و عرفان اور ذکر و فکر سے محفلیں گرم رہتی تھیں حکیم محمد عمر چرتھاولی نے نہایت مسجع و مقفیٰ عبارت میں اس مسجد کا نقشہ پیش کیا ہے:-

"سبحان اللہ و بحمد اللہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ یہ مسجد عبادت گاہِ قدسی نفساں تھی۔ ہمپایہ نجوم یہاں کے نمازی تھے۔ ہم مرتبہ فلک یہاں کی زمین تھی۔ ایک طرف شمال کے حجرے میں" مثال قطب شمالی، عاشق ذو الجلال شہید لم یزلی، ولی ازلی، حافظ ضامن علی رحمۃ اللہ علیہ یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔ ایک جانب جنوب کی سہ دری میں حضرت فیض درجت سلطانِ زمین ولایت و کرامت، ماہِ آسمان رفعت و عظمت، درویش صاحب برکت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ سرگرم قال اللہ و قال الرسول رہتے اور مسجد کے سامنے کو گرتے پڑتوں کے تھامنے کو، مشرق کے حجرے میں ہمارے مرشد مشفق قدس سرہٗ الخالق .... کبھی درس و تدریس طلبہ میں .... کبھی مشاہدات ذات و سلطان الاذکار میں مستغرق ......" ؎

یہ نقشہ تو ان حضرات کی روحانی زندگی کا تھا۔ اب آپس کی بے تکلفی

؎ تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء

کی بھی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ فرمائیے۔ تینوں بزرگ بچپن کے دوست تھے۔ اُس وقت جو تعلقات قائم ہو گئے تھے اور جس بے تکلفی کا مظاہرہ وہ عہدِ طفلی میں کرتے تھے مسندِ رشد و ہدایت پر فائز ہونے کے بعد بھی ان کے اس رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ارواحِ ثلثہ کی درج ذیل حکایت ان قدسی نفسوں کی پاک زندگیوں کے اسی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔

فرمایا کہ:۔

جب حاجی صاحب یہاں یعنی خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں تشریف رکھتے تھے تو ایک تھالی میں کچھ چنے، کچھ کشمش ملی ہوئی رکھتے تھے۔ صبح کے وقت مولانا شیخ محمد صاحب اور حافظ محمد ضامن صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم ساتھ مل کر کھایا کرتے تھے۔ اور آپس میں خوب چھینا جھپٹی ہوا کرتی تھی۔ بھاگے بھاگے پھرتے تھے اس وقت مشائخ اس مسجد کو "دوکان معرفت" کہتے تھے اور تینوں کو اقطاب ثلثہ، حضرت حاجی صاحب دہلی کے شہزادوں میں اور علماء میں بزرگ مشہور تھے۔ مگر پیر بھائیوں میں چھینا جھپٹی کرتے تھے"[1]

حضرت مولانا رشید احمدؒ سے مناظرہ | حضرت مولاناؒ کی مکہ معظمہ سے واپسی

---

[1] ارواحِ ثلثہ۔

کے چند روز بعد غالباً ۱۲۶۴ھ یا ۱۲۶۵ھ میں آپ کے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مابین کسی حدیث کے بارے میں کچھ اختلاف ہو گیا بات معمولی سی تھی لیکن مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے اپنی تالیف تذکرۃ الرشید میں جو حضرت مولانا رشید احمدؒ کی سوانح حیات ہے اپنے ممدوح کو اوائل عمر ہی سے سلیم و حلیم اور معصوم عن الخطا ثابت کرنے کے لئے واقعات میں اس قدر رنگ آمیزی کی کہ اس سے حضرت مولانا شیخ محمد کی شخصیت داغدار ہو کر رہ گئی۔

اس واقعہ کو صحیح خدو خال کے ساتھ پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ دونوں فریقوں کی شخصیتوں کو واضح کر دیا جائے۔

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے جو حالات اب تک بتائے گئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی عمر اس بحث یا نام نہاد مناظرہ کے وقت تقریباً ۳۵ سال تھی۔ آپ کا علمی مرتبہ ہر جگہ تسلیم کر لیا گیا تھا حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق اور حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب سے آپ نے علوم ظاہری کی تکمیل کی تھی اور حضرت میانجیو نور محمدؒ اور حضرت مولانا شاہ محمد یعقوبؒ سے باطنی فیض حاصل کیا تھا۔ پھر شروع ہی سے حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت حافظ ضامن کی صحبت میں رہتے تھے اور راہ سلوک میں وہ بلند مقام حاصل کر چکے تھے جہاں پہنچکر بقول حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب۔

"تم کو اب کچھ احتیاج اکتساب باقی نہیں رہی"

ان کے مقابلہ میں حضرت مولانا رشید احمدؒ شباب کی ابتدائی منزل

سے گذر رہے تھے۔ بیس اکیس سال کا سن تھا اور بقول تذکرۃ الرشید صاحب
"فارغ التحصیل اور علامہ ہونے کے علاوہ صاف گو، تحریر
و تقریر میں بیباک، جوان طبیعت، تازہ علم اور مذہب
پر طرہ یہ کہ حق بات کے اندر مناظرہ اور مباحثہ میں مرد
دلیر و نڈر اس لئے آپ کا قلم نہ رکا اور جو لکھنا تھا صاف
صاف لکھ دیا"

شباب اور جوان العمری کی ان غیر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ابھی تک باطنی علم سے بے بہرہ اور مولانا عاشق الٰہی کے اس فقرہ کے مصداق تھے
"مگر علم کا غلبہ تھا اور علم کے لئے تفقہ لازم نہیں"

اس پس منظر کے ساتھ اب واقعات کی کڑیوں کو ملایا جائے تو پوری داستان اس طرح مرتب ہوتی ہے۔

حضرت مولانا شیخ محمد نے جن کا علم حدیث میں پایہ ہمیشہ بلند سمجھا جاتا رہا ہے کسی حدیث سے ایک مسئلہ کا استنباط کیا۔ قاعدہ ہے کہ نوجوان جو تازہ تازہ کسی درس گاہ سے پڑھ کر نکلتے ہیں، جا و بیجا اپنی علمیت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمدؒ کا بھی وہی دور تھا انہوں نے جوش میں آکر حضرت مولانا شیخ محمد کی رائے کی تردید کردی۔ حضرت مولانا نے اس کا نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ایک علمی بحث میں حضرت مولانا رشید احمد کا بھی وہی انداز ہونا چاہیئے تھا لیکن جوانی کی ترنگ میں جواب الجواب کے ساتھ ساتھ ثقاہت کے درجہ سے گرا ہوا یہ شعر بھی لکھ گئے ؎

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے[1]

ہر صاحب ذوق اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس شعر کو ایسی بحث میں جو حدیث اور فقہ سے متعلق تھی پیش کرنا غلط اقدام تھا یا اس کو پڑھ کر برافروختہ ہونا تفقہ اور تورع خلاف تھا۔ اس بات کا اعتراف خود مولانا عاشق الٰہی کو بھی ہے کہ

"یہ مولانا کا لکھا ہوا شعر چونکہ زیادہ ناگوار گذرا اس لئے خفا ہوئے اور جو کچھ زبان پر آیا کہا"۔

مگر چونکہ حضرت مولانا رشید احمدؒ ان کے ممدوح ہیں اس لئے فیصلہ ان کے حق میں اور حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے خلاف ان الفاظ میں سناد یتے ہیں۔

"دیگر علم کا غلبہ تھا اور علم کے لئے تفقہ لازم نہیں غلطی و

---

[1] اس قسم کے اشعار ایسے معرکوں کی رونق کو بڑھا سکتے ہیں۔ جیسا انشا اور مرزا عظیم کے مابین تھا، اور جس کا نقشہ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اس معرکہ میں عظیم بیگ نے انشا کے پھکڑ پن کا جو جواب ایک مخمس کے ذریعہ دیا اس کے ایک بند کا ٹیپ اسی شعر کا دوسرا مصرع ہے ملاحظہ ہو!۔

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق ۔۔ تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق ۔۔ شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

خطا سے معصومیت ضروری نہیں[1] اس لئے حقیقتاً اس مسئلہ کے اندر چوکے اور لغزش کھائی "۔

بہرحال جب تحریر سے کام نہ چلا تو حضرت مولانا رشید احمدؒ زبانی مناظرہ کے لئے تھانہ بھون پہنچے لیکن حضرت مولانا سے ملاقات ہونے سے پہلے ہی حاجی امداد اللہؒ کے مرید ہوگئے۔ اور انہوں نے مناظرہ سے روک دیا۔

---

[1] مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے یہ بات نہایت اصولی بیان فرمائی ہے، لیکن اگر وہ اسی اصول کو سب جگہ برتتے تو وہ اصول تھا ورنہ بے اصولی کے سوا اس کو اور کیا کہا جاسکتا ہے، حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے متعلق تو یہ اصول بیان کرکے کہ غلطی وخطا سے معصومیت ضروری نہیں جگہ جگہ ان کی غلطیاں گنا دیتے ہیں اور حضرت مولانا رشید احمد کی زبانی یہ الفاظ کہلوا کر کہ

خود بندہ کو یہ واقعات پیش آئے ہیں کہ جناب حضرت حاجی صاحب اور حافظ صاحب جو پہلے سے مولوی شیخ محمد صاحب سے مسائل دریافت کرکے ان پر عامل تھے، بندے کے کہنے سے کتنے ہی مسائل کے تارک ہوگئے اور واللہ کہ حافظ صاحب نے یہ کلمہ میرے سامنے فرمایا کہ ہم کو بہت سے مسائل میں ہمیشہ دھوکا رہا ہے"۔

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کو زیور علم تک سے عاری کرنا چاہتے ہیں، اور جہاں اپنے ممدوحین کا ذکر آتا ہے وہاں ان کی لغزشوں کے لئے حسین توجیہات پیش کردیتے ہیں۔

جنگ آزادی کے شروع میں تھانہ بھون کی حالت

اس واقعہ کے بعد سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ تک کے حالات پردہ خفا میں ہیں۔ قیاس ہے کہ یہ دور بھی حضرت مولانا شیخ محمدؒ نے علمی مشاغل اور عبادت و ریاضت میں گذرا۔ ان ایام میں دہلی کا آنا جانا ہوتا رہا۔ نواب صدیق حسن سے اسی زمانہ میں ملاقات ہوئی جس کا ذکر پیشتر کسی موقعہ پر کیا جا چکا ہے۔

۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ میں وہ ہنگامہ بلاخیز رونما ہوا، جس کو برطانوی عہد میں ہمیشہ غدر کا نام دے کر بدنام کیا جاتا رہا، لیکن اب اسی کو محبان وطن کی جان فروشی کا ایک بے بدل کارنامہ بتا کر جنگ آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ ہنگامہ کس طرح شروع ہوا اور ملک کے مختلف گوشوں میں کیسے پھیلا ان باتوں کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ اس امر کا اظہار کر دینا ناگزیر ہے کہ عام ہنگامہ کے دوران تھانہ بھون کی فضا پرسکون رہی۔ زبانی روایتوں سے اس کے دو وجوہ معلوم ہوئے ہیں[1]۔

(۱) قاضی سعادت علی جو قاضی عنایت علی کے والد تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم رہ چکے تھے، اس لئے ان کو اور ان کے صاحبزادوں کو کمپنی کی وفاداری ملحوظ تھی۔

(۲) قاضی عنایت علی نے اپنے زمانہ میں کمپنی کے وفادار رہنے کا معاہدہ

---

[1] قاضی محمد مکرم صاحب مائل تھانوی کی زبانی روایت ہے۔

کیا تھا جس کو نباہنا وہ اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

حقیقت کچھ ہو یہ امر اپنی جگہ مسلّم ہے کہ تین چار ماہ تک ملک کے مختلف حصوں میں جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے، لیکن تھانہ بھون میں اس کی ایک ہلکی سی چنگاری بھی نہیں پہنچی۔ اس مثالی امن و امان کے قیام کا سہرا قاضی عنایت علی کے سر ہے[1]

قاضی عنایت علی قصبہ کے ذی اثر رئیس تھے اور وہ اپنی ریاست کا انتظام و انصرام نہایت قابلیت سے کر رہے تھے۔ قصبہ کے لوگ ان کی خوش تدبیری اور حسن سلوک سے ان کے اس قدر گرویدہ تھے کہ امن و امان قائم رکھنے میں سب نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔

---

[1] مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیت علماء ہند نے "علمائے ہند کا شاندار ماضی" میں یہ بات ثابت کرنی چاہی ہے کہ علمائے تھانہ بھون نے جن کے سربراہ حضرت حاجی امداد اللہ تھے میرٹھ اور دہلی کے ہنگاموں کی خبر پاتے ہی جہاد کی تیاری شروع کر دی تھی اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو دہلی بھیجا تھا مگر وہ جہاد کی کوئی صورت بنتے نہ دیکھ کر واپس آگئے

مولانا نے محض ظن و تخمین کی بنیاد پر یہ تمام عمارت کھڑی کی ہے ورنہ انہیں اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملا H. G. KEENE کے مرتب کردہ حالات سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ شاملی کا زمیندار تحصیل دار ابراہیم خاں کا مخالف تھا، اور بادشاہ دہلی سے ساز باز کر رہا تھا۔ اسی لئے انگریزوں کو شاملی کی حفاظت کے لئے کافی انتظامات کرنے اور وہاں سپاہی اور اسلحہ جات رکھنے پڑے۔ تھانہ بھون کی طرف سے کوئی خدشہ نہیں تھا اس لئے وہاں کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔

تھانہ بھون میں جہاد کے اسباب واقعات اور نتائج

تین چار ماہ کی مدت گزرنے کے بعد ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ رونما ہوا جس نے تھانہ بھون کے اس مثالی امن کو ختم کر دیا اور جنگ کے جو شعلے ملک کے دوسرے حصوں میں بھڑک رہے تھے انہوں نے اس قصبہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر یہاں کی خوشحالی اور سکون و اطمینان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

یہ حادثہ اس طرح وقوع پذیر ہوا کہ قاضی عنایت علی کے برادر خورد قاضی عبدالرحیم جو بڑے بھائی کو باپ کے مثل سمجھتے تھے اور ریاست کے کاموں سے علیحدہ رہ کر امیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ کسی غرض سے مع چند احباب و رفقاء سہارنپور تشریف لے گئے اور وہاں سرائے میں مقیم ہوئے۔ تھانہ بھون کے ایک کائستھ نے جو کلکٹری میں سررشتہ دار تھا، کسی خاندانی چشمک و عداوت کی بنا پر حاکم ضلع رابرٹ اسپنکی سے شکایت کر دی کہ تھانہ بھون کا رئیس کمپنی سے باغی ہو گیا ہے اور دہلی کے باغیوں کو امداد پہنچانے کی غرض سے سامان حرب خریدنے کے لئے سہارنپور آیا ہے۔

یہ دور ایسا تھا جب معمولی سے شبہ پر دار و رسن کی تیاری ہوتی تھی، انگریز باغی اور بغاوت کے نام سے بھڑکتا تھا۔ قدرتی طور پر اسپنکی کو کچھ شک اور

لہ سہارنپور میں اس وقت جو حالات گذر رہے تھے ان کا مفصل تذکرہ HENRY GEORGE KEENE کی کتاب SOME ACCOUNT OF THE ۴۴

(باقی نوٹ صفحہ ۴۸ پر)

کچھ یقین ہوا، پھر بھی اس نے حقیقت حال معلوم کرنی چاہی مگر جب مقدر ہی برگشتہ تھا تو اس کی کوشش کس طرح اچھے نتائج پیدا کر سکتی تھی، خود قاضی عبدالرحیم کے بعض عزیزوں نے بے رخی اختیار کی اور کلکٹر سے مرعوب ہو کر کچھ ایسے جوابات دئیے جن سے اس کے یقین میں جو تھوڑی بہت کمی تھی وہ بھی جاتی رہی اور قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقا کو وقت کے قانون کے مطابق موت کی سزا دیدی گئی۔ یہ خبر وحشت اثر آناً فاناً تھانہ بھون جا پہنچی، قاضی عنایت علی اپنے عزیز بھائی کے اس مظلومی کے ساتھ مارے جانے کا حال سن کر متاع ہوش وحواس کھو بیٹھے اور جذبۂ انتقام سے سرشار ہو کر انگریزوں سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اسپنکی کو اطلاع ملی تو وہ اپنے اس عاجلانہ اقدام پر بہت پشیمان ہوا، اس نے قاضی عنایت علی سے اپنے دلی تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہلوایا کہ:۔

"یہ سب کچھ نادانستگی میں ہو گیا ہے، آپ صبر وشکیب کو کام میں لائیں اور کوئی کارروائی نہ کریں۔ ہم آپ کو مزید جائیداد

ADMINISTRATION OF INDIAN DISTRICTS DURING THE REVOLT OF BENGAL ARMY. کے باب اول میں ملاحظہ فرمائیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا محمد میاں صاحب نے کس بنیاد پر لکھ دیا کہ "ہاتھی خرید کر دہلی بھیجنے کی اطلاع کچھ غلط نہیں تھی۔"

— (۷) —

عطا کریں گے اور تھانہ بھون کا مستقل نواب تسلیم کرلیں گے"

سنا ہے کہ بعض عزیزوں اور خیر خواہوں نے بھی قاضی عنایت علی کو سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور جذبۂ انتقام سے ایسے مغلوب ہو کہ اپنے انجام پر قطعاً غور نہیں کیا۔ ان کے لئے اس وقت صبر کرنا مشکل بھی تھا، اس لئے کہ جس بھائی کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور جو بھائی ان کا صحیح معنوں میں دست و بازو تھا وہ ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہو گیا۔ یہ صدمہ ایسا جانکاہ تھا کہ اس کی وجہ سے قاضی صاحب جو کچھ کر گذرتے کم تھا، چنانچہ انہوں نے اسپنکی کی نشکش اور عزیزوں کے مشورہ کو ٹھکرا دیا اور لڑائی کے منصوبے بنانے شروع کر دیے۔ یہ دیکھ کر قصبہ کے مقتدر حضرات نے جنگی مہمات کو ترتیب دینے کے لئے ایک مجلس مشاورت منعقد کی جس میں قرب وجوار کے قصبوں سے اس زمانہ کے تمام نامی گرامی علماء بلائے گئے۔ اراکین مجلس میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا شیخ محمد، حافظ محمد ضامن علی، شاہ مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی اور مولانا محمد احسن نانوتوی [1]

---

[1] ان ہی اکابر میں سے اکثر نے شاملی کے معرکہ میں حصہ لیا تھا۔ حیرت ہے کہ سرسید نے ان مقدس روحوں کے لئے مفسد کا لفظ استعمال کیا ہے۔

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں ⁂ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اس مشورہ میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر جنگ کی جائے تو اس کو جہاد کہا جائے گا یا نہیں۔ حضرت مولانا شیخ محمدؒ اور حضرت مولانا محمد... کا اجتہاد یہ تھا کہ اس جنگ کو جہاد نہیں کہا جا سکتا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی ایک دلیل یہ بھی کہ :-

"جب قاضی عنایت علی عام جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرین مجلس میں سے بھی اس وقت کسی نے اس کو جہاد سمجھ کر اس میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جبکہ انتقام کا جذبہ کار فرما ہے اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جا سکتا ہے"

مولانا شیخ محمدؒ کا اجتہاد صحیح تھا یا غلط اس کا علم تو خدا کو ہے نا معتبر ذریعہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ کی یہ رائے معلوم ہوئی

"نیت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے، بظاہر تو اس کو جہاد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا"

حکیم الامت کے اس فتویٰ سے حضرت مولانا پر سے یہ اعتراض خود ہٹ جاتا ہے کہ آپ نے اپنے غلط اجتہاد کی بنا پر اس کو جہاد کہنے سے انکار کر دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ آپ کی رائے سراسر حقانیت پر مبنی تھی کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کو اپنے ماموں زاد بھائی اور برادر نسبتی قاضی عبدال... کے پھانسی پا جانے کا اتنا بھی صدمہ نہیں تھا جتنا حضرت مولانا قاسمؒ سچ پوچھئے تو حضرت مولاناؒ کا یہ ذاتی معاملہ تھا، لیکن چونکہ آپ اپنے زمانے ایک بڑے عالم تھے اور علمائے حق کے لئے شریعت کے مقابلہ میں ...

معاملات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اس لئے آپ نے جو بات حق سمجھی اس کو ظاہر کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

بہر حال حضرت مولانا کا یہ اپنا اجتہاد تھا جس کو مجلس شوریٰ کے دیگر اراکین نے تسلیم نہیں کیا اور متفقہ طور پر انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے دست حق پرست پر جہاد کی بیعت کی گئی۔ اسی وقت سے انگریزی حکومت کے ختم ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا اور قصبہ میں شرعی حکومت قائم ہو گئی حضرت حاجی صاحبؒ اس کے امیر مقرر ہوئے[1]۔

جہاد کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قاضی عنایت علی نے اپنے چند آدمیوں کی ہمراہی میں انگریزوں کے وہ اسلحہ اور کارتوس جو بہنگیوں میں سہارنپور سے کیرانہ لیجائے جا رہے تھے چھین لئے۔ انگریز افسر جو ساتھ تھے مقابلہ میں آکر مارے گئے۔ سہارنپور اور مظفر نگر کے حکام کو اس سانحہ کی اطلاع ملی تو وہ بدلہ لینے کے لئے موقعہ کے منتظر رہے۔

اس وقت شاملی تجارتی منڈی ہونے کے اعتبار سے نیز بعض

---

[1] مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے مصلحت وقت کے پیش نظر واقعات اس انداز سے بیان کئے ہیں کہ ان کی تحریر بہت پیچیدہ ہو گئی ہے۔ اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شرعی حکومت کا نفاذ کس وقت سے ہوا مولانا محمد میاں صاحب محض قیاس کی بناء پر تحریر فرماتے ہیں کہ دہلی میں لڑائی شروع ہونے کے کچھ روز بعد ہی شرعی حکومت قائم ہو گئی تھی لیکن قرین صواب یہی روایت ہے کہ اس حکومت کا قیام مجلس شوریٰ کے بعد عمل میں آیا۔

اور وجوہ سے ایک اہم جگہ سمجھی جاتی تھی۔ وہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی مہر سنگھ اس قصبہ کا بڑا زمیندار اور ڈپٹی کلکٹر تھا۔ ابراہیم خاں سب کلکٹر (تحصیلدار) سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے؛ چنانچہ اس نے شاہ دہلی سے نامہ و پیام شروع کیا۔ انگریز حکام کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے حفاظتی تدابیر اختیار کیں۔ گرانٹ[1] پہلے سے کچھ سواروں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اوائل ستمبر میں حاکم ضلع آر۔ ایم ایڈورڈس نے کچھ پیدل فوج اور دو توپیں اس کی مدد کے لئے بھیج دیں۔ اس کے بعد ایڈورڈس خود بھی پہنچ گیا لیکن ۱۴ ستمبر کو وہ فرسٹ پنجاب کیولری کے تقریباً ۱۰۰ ہتھیار بند آدمی سب کلکٹر ابراہیم خاں کی مدد کے لئے چھوڑ کر بڑھانہ کے قلعہ کی طرف چلا گیا اور اس کے

---

[1] سی گرانٹ ضلع مظفر نگر کا جائنٹ مجسٹریٹ تھا۔ اس نے جنگ آزادی کے بعد ابراہیم خاں کے بیٹے کی درخواست پر اس کو ایک سرٹیفکٹ دیا تھا جس میں ابراہیم خاں کی خدمات کو سراہا تھا اور اس کی وفاداری کی تعریف کی تھی اسی سرٹیفکٹ میں گرانٹ لکھتا ہے:

"خصوصاً شروع اس غدر میرٹھ سے ہم شاملی کو تشریف لے گئے تھے اور دو روز ماہ جون اور بارہ روز ماہ جولائی اور چودہ روز ماہ ستمبر ہم وہاں مقیم رہے......"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماہ ستمبر میں بھی ۱۴ روز تک گرانٹ کا قیام شاملی میں رہا مگر مجاہدین کے حملہ کے وقت وہ یقیناً وہاں موجود نہیں تھا کیونکہ اس نے خود اپنی موجودگی کا اظہار کیا ہے اور نہ ستمبر کے بعد اسکے متعلق کچھ لکھا ہے۔

آسانی سے قابض ہو گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں مجاہدین تھانہ بھون یلغار کر کے شاملی پہنچ گئے اور تحصیل پہ جو ایک مستحکم قلعہ کی حیثیت رکھتی تھی حملہ آور ہوئے۔ یہ معرکہ نہایت سخت تھا لیکن مجاہدین نے دلیری و جرأت سے کام لے کر تحصیل کا پھاٹک توڑ دیا اور اندر گھس گئے۔ محصورین ہتھیار ڈالنے پہ مجبور ہوئے۔

"انگریز وقائع نگار ہنری جارج کین کا بیان ہے کہ :۔

لڑائی تمام دن جاری رہی لیکن چونکہ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی اور کچھ خانہ بدوش بھی ان کی طرف آملے تھے اس لئے ان کا پلہ بھاری رہا۔ انہوں نے بہت سی عمارتوں کے چھپروں میں جو احاطہ کی دیوار سے باہر نکلے ہوئے تھے آگ لگا دی۔ محصورین میں سے ۱۱۳ آدمی مارے گئے جن میں ابراہیم خاں سب کلکٹر بھی تھا۔"

علمائے ہند کے شاندار ماضی میں تحریر ہے کہ :۔

"لڑائی تین دن تک جاری رہی، جس میں مجاہدین کا بہت نقصان ہوا، تیسرے دن حضرت حافظ ضامن علی شاہؒ نے سرفروشی کو کام میں لا کر تحصیل کا دروازہ توڑ دیا اور خود انگریزی فوج کی گولی سے شہید ہو گئے۔

سرسید مرحوم اس جنگ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں :۔

"ستمبر ۱۸۵۷ء میں دفعتاً مسلمانان ساکنان تھانہ بھون نے

جس کا افسر قاضی عنایت علی تھا فساد برپا کر دیا اور ایک بیٹے گروہ نے تحصیل شاملی پر حملہ کیا۔ اس وقت تحصیل شاملی میں تخمیناً دس سوار پنجابی رسالہ کے اور اٹھائیس سپاہی جیل خانہ کے اور پچاس سے زاید سپاہی متعینہ تھانہ اور تحصیل کے باقی آدمی اس افسر کے خاندان کے مع اکبر خاں اس کے بھائی کے جھنجھانہ سے گئے تھے اور وہاں موجود تھے۔ یہ افسر بہ کمال دلاوری و بہادری بمقابلہ پیش آیا اور تحصیل شاملی کو مستحکم کرا کر اور اس میں محصور ہو کر بخوبی لڑا اور ہر دفعہ مفسدوں کے حملہ کناں کو ہٹا دیا اور بہت سے آدمی ان میں کے مارے گئے۔ آخر کو گولی و بارود تحصیل میں ختم ہو چکی اور نہایت مجبوری کا وقت آیا اور مفسدوں کو قابو ہو گیا اور وہ لوگ تحصیل کے قریب آ گئے۔ یہاں تک کہ تحصیل میں گھس آئے، وہاں بھی مقابلہ ہوا اور یہ افسر نہایت بہادری سے مع اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام آیا اور شرط نمک حلالی کو پورا کیا۔ یہ قتل و خونریزی شاملی میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو واقع ہوئی، جو دن کہ فتح دہلی کا تھا مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے کان تک مژدہ فتح دہلی جس کا وہ ہر دم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا۔ اس ہنگامہ میں ۱۱۳ آدمی جن میں سو سے زیادہ مسلمان تھے کام

آئے اور ہر ایک تمغۂ خیر خواہی سرکار کا اپنے نام کے
ساتھ لے گیا۔ یہ ہنگامہ جو تحصیل شاملی میں تھانہ بھون کے
مفسدوں کے ساتھ ہوا وہ ہنگامہ ہے جس کا مفسدانِ تھانہ بھون
نے جہاد نام رکھا تھا۔ مگر ان تمام حالات کو دیکھنے سے
واضح ہوگا کہ جو لوگ ان مفسدوں کے مقابلہ میں آئے اور دو
بدو ہوکر لڑے اور بہتوں کو جان سے مارا اور مرتے دم تک
مقابلہ و مقاتلہ سے باز نہ رہے وہ بھی مسلمان تھے اور نیک
بخت اور اپنے مذہب کے پکے[1] اس سے صاف ثابت ہوتا ہے

---

[1] اگر وہ نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے ہوتے تو انگریز کی خیر خواہی میں ان کے خلاف
سینہ سپر نہ ہوتے۔ مجاہدین کا مقابلہ انگریز سے تھا نہ کہ ابراہیم خاں یا اس کے رفقاء
سے۔ اب اگر یہ لوگ خود اس حملہ کا جواب دینے کے لئے میدان میں نکل آئے تو اس
میں مجاہدین کا کیا قصور تھا۔ ابراہیم خاں اور اس کے رفقاء میں اگر دین کا پاس و لحاظ تھا
تو ان کو چاہئے تھا کہ میدان سے ہٹ جاتے مگر بقول گرانٹ:-

"جب گروہ باغیوں کا جس میں غازی، دارانگر وغیرہ قصبہ جات کے
کثرت سے تھے بسرداری قاضی عنایت علی خاں کے تحصیل پہ چڑھ
آئے اور محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ باوجود اس کے تحصیلدار نے ان کا مقابلہ
کیا...."

ایسی صورت میں اگر مجاہدین جنگ سے دستبردار ہو جاتے تو حصول مقصد کے لئے اور ن ص ۱۰۳

کہ مفسدوں نے صرف فساد مچانے اور غلغلہ ڈالنے اور ہنگامہ کرنے کو اپنے فسادوں کو جھوٹا جہاد کے نام سے مشہور کیا تھا"......

غرض شاملی کی فتح نے وقتی طور پر انگریزی حکومت کو دبنے پر مجبور کر دیا۔ مجاہدین اس نمایاں کامیابی کے بعد تھانہ بھون لوٹ آئے اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کے جسدِ مبارک کو لاکر آسودۂ خاک کیا۔ آپ کا مزار پر انوار شہر سے ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے بیرون کے باغات کے درمیان واقع ہے۔ چار دیواری چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ آج بھی خاک و خشت کے اس انبار سے طرح طرح کی کرامتوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

شاملی کی شکست نے انگریزوں کو بے انتہا مشتعل کر دیا۔ ایڈورڈس ٹرمنام کے قلعہ کو فتح کر کے لوٹا تو اس کی فوج میں دو توپوں اور ۱۰۰ اسکود سپاہیوں کا اضافہ ہو گیا تھا، وہ سمجھ رہا تھا کہ میرے شاملی پہنچنے سے وہاں کی فوج کو تقویت ہو گی، لیکن راستہ ہی میں تھا کہ اسے تحصیل پر مجاہدین کے قبضہ کی اطلاع ملی اس نے اس تاراجی کا بدلہ لینے کے لئے اسی وقت تھانہ بھون پر حملہ کرنا چاہا لیکن یہ معلوم کر کے کہ مظفر نگر کی حالت زیادہ تشویشناک ہے وہ تھانہ بھون کو چھوڑ

ہو گیا صورت اختیار کرتے، درحقیقت ابراہیم خاں اور اس کے ساتھیوں کے اسلام کا حوالہ دے کر لوگوں کو مغالطہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ورنہ ابراہیم خاں کا جذبہ ایمانی تو سرسید کے اسی فقرہ سے جھلک رہا ہے وہ مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے کان تک مژدہ فتح دہلی جس کا وہ ہر دم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا"۔

کو اس طرف متوجہ ہو گیا۔

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ کو انگریزوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ہو گیا تھا، ادھر ایڈورڈس نے مظفر نگر پہنچ کر وہاں کے حالات درست کئے۔ جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو پھر تھانہ بھون کی جانب توجہ کی۔ ان ہی ایام میں کمشنر میرٹھ اور کلکٹر سہارنپور (رابرٹ اسپنکی) کے پاس سے کمک آگئی اور کمشنر مذکور کا اشارہ پاکر ایڈورس نے تھانہ بھون کی طرف کوچ کر دیا۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس کے ساتھ کل کتنی فوج تھی۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس میں کچھ سکھ پیدل اور سوار۔ کچھ گورکھے اور دو توپیں تھیں۔ اس فوج کے ساتھ دو سول افسر بھی تھے ایک سوینٹن میلول اور دوسرا ملکم لو موخر الذکر کو رابرٹ اسپنکی نے آخری امدادی فوج کے ساتھ بھیجا تھا۔

ایڈورڈس نے دن اور تاریخ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہ حملہ ۱۲ ستمبر کے بعد ہوا تھا۔

کپتان اسمتھ اور لفٹیننٹ کوٹیار کی ماتحتی میں سکھوں اور گورکھوں کی ایک جمعیت نے حملہ کیا اور آبادی سے باہر کی چند عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔ کچھ فوج شہر میں داخل ہو گئی، لیکن مجاہدین نے یہ حملہ بری طرح پسپا کر دیا۔ انگریزی فوج کے ۱۷ آدمی مارے گئے اور ۲۵ زخمی ہوئے جن میں دو افسر تھے۔ پسپائی کے وقت میلول اور لو نے بڑی سمجھداری سے کام لیا اور وہ اپنی فوج کو تباہی سے بچا کر نکال لے گئے۔ حالانکہ خود لو ایک معرکہ میں زخمی ہو گیا۔ اس کے زخمی ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی فوج کو ملنے

ہوئے ایک گاؤں کی تنگ گلیوں سے گذر رہا تھا تو ایک جتھے نے اس کو گھیر لیا، دست بدست لڑائی ہوئی جس میں اس کے تلوار کے تین نہایت گہرے زخم آگئے۔

اس شکست نے انگریزوں میں کافی کھلبلی ڈال دی، کمشنر، اسپنکی کو اور اسپنکی فوجی افسروں اور کلکٹر مظفر نگر ایڈورڈس کو متہم گردانتے لگے لیکن کین کی رائے ہے کہ اس سانحہ کی پوری ذمہ داری درحقیقت کمشنر پہ عاید ہوتی ہے، اس لئے کہ اسی نے تھوڑی سی فوج بھیجکر ایڈورڈس کو یہ نادرشاہی حکم دیا تھا کہ:-

"فوراً بڑھو اور مفسدوں کا سر کچل دو"

مگر جب دوبارہ غور کرنے پر اسے محسوس ہوا کہ یہ احکامات قبل از وقت نافذ کر دئے گئے ہیں تو اس نے حملہ کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دینا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا، اس کے پہلے حکم کے مطابق حملہ کیا جا چکا تھا اور پسپا بھی ہو گیا تھا

بہر حال اس شکست کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مزید کمک آگئی اور ستمبر کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے انگریزی فوج نے بغیر کسی مزاحمت کے تھانہ بھون پر قبضہ کر لیا۔[1] مجاہدین اپنے گھروں کو چھوڑ کر مختلف شہروں اور قصبوں

---

[1] یہ واقعات کین کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ دوسرے ذرائع کو چھوڑ کر ہم نے ایک انگریز کے تحریر کردہ واقعات کو کتاب کے متن میں اس لئے شامل کرنا مناسب سمجھا کہ قارئین دیکھ لیں کہ مصنف کے تعصب کے باوجود مجاہدین کے جوش

طرف چلے گئے۔

قبضہ مکمل ہو جانے کے بعد انگریزی فوج نے تھانہ بھون کو جس
طرح تباہ و برباد کیا اس کی صحیح تصویر مولانا عاشق الٰہی کے بیان میں
ملاحظہ فرمائیں۔

"صبح صادق نمودار ہوئی تو بلائے بے درماں ساتھ لائی
تھانہ بھون کو انگریزی فوج نے گھیر لیا اور مشرقی سمت سے

اور ان کے عظیم کارناموں کی ایک ہلکی سی جھلک اس کے بیان میں بھی موجود ہے
لیکن کا بیان اس معاملہ میں مولانا محمد میاں کے بیان کے مطابق ہے یہ دونوں
مصنف حملوں کی تعداد دو بتاتے ہیں۔ قاضی محمد مکرم صاحب مائل کے بیان کے مطابق
قصبہ پہ کل چار حملے ہوئے۔

پہلے حملے میں ایک ہزار سپاہی اور چھ توپیں تھیں۔ جلال آباد اور تھانہ
بھون کے راستہ پہ مجاہدین نے اس فوج کا مقابلہ کیا اور اسے پسپا کر دیا۔

دوسرا حملہ دو ہزار فوج سے ہوا اس میں بھی چھ توپیں تھیں، مجاہدین
نے بہادری سے مقابلہ کر کے اس حملہ کو بھی ناکام بنا دیا۔ توپوں سے محض دو
گولے چلنے کی نوبت آئی تھی کہ مجاہدین نے ان کو بیکار کر دیا اور انگریزی فوج
اس مرتبہ بھی ہزیمت خوردہ واپس ہو گئی۔

تیسرا حملہ زیادہ سخت تھا۔ اس مرتبہ انگریزی فوج کی تعداد چھ ہزار
تھی اور پورا توپ خانہ مع گولا بارود ساتھ تھا۔ یہ فوج بڑھتی ہوئی حوض والی

گولا باری شروع ہو گئی۔ دن ہوا تو فوج قصبہ میں داخل ہوئی۔ قتل و قتال اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا رات کی تاریکی چھانے سے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے مسمار کر دیئے گئے۔ اور مکانات پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی ...... حاکم ضلع کا وہ قول صحیح ہوا کہ اسی طرح عقانہ بھون کو مسمار کرا کر چھوڑوں گا"۔

وفاداران سرکاری کو دل کھول کر انعامات سے نوازا گیا اور جن کو باغی سمجھا گیا ان کو سخت سزائیں دی گئیں۔

دیگر مجاہدین کی طرح قاضی عنایت علی نے بھی اپنے وطن کو خیرباد کہا اور نجیب آباد کی طرف چلے گئے۔ وہاں نواب محمود خاں کے ساتھ مل کر کئی مہینہ تک انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔

ص۲۵ مسجد تک جہاں مولانا شیخ محمد رح کا مکان تھا پہنچ گئی، لیکن قاضی عنایت علی نے نہایت بہادری سے اس کا مقابلہ کیا اور اس دفعہ بھی انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مجاہدین نے ان کا تعاقب جلال آباد سے بھی آگے تک کیا پھر لوٹ آئے۔

جب تیسرا حملہ بھی پسپا ہو گیا تو انگریزوں نے جھلا کر بارہ ہزار اور ایک روایت کے بموجب چوبیس ہزار سپاہ اور توپ خانہ کے ساتھ چوتھی مرتبہ حملہ کیا مجاہدین اس کو نہ روک سکے اور میدان کو چھوڑ دینے پر مجبور ہوتے جس کو جہاں موقع ملا چلا گیا۔ قصبہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور اس کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا۔

سرسید نے اپنی تصنیف سرکشی ضلع بجنور میں لکھا ہے کہ :-

"پرتاب سنگھ کے گڑھ مکتیشر چلے جانے کے بعد[1] جنرل محمود[2] خاں چودھریوں کی جانب سے مطمئن ہو گیا۔ گنگا پار کے جو باغی تھے انہوں نے بھی اپنے لئے بجنور سے زیادہ کوئی مامن نہ دیکھا۔ چنانچہ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجر اور رضا حسن عرف چھٹن اور عنایت علی قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے۔ اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا۔۔۔۔ قاضی عنایت علی اور دلیل سنگھ گوجر اور حسن رضا عرف چھٹن دو ضرب توپ اور دو ہزار آدمی کی جمعیت سے میراں پور اتر آئے اور میراں پور کے تھانہ کو لوٹ لیا[3] اور کئی آدمیوں کو قتل کیا اور محمود خاں کے نام کی منادی پٹوائی اور پھر بھاگ آئے۔

---

[1] یہ واقعہ اوائل نومبر کا ہے۔

[2] سرکشی ضلع بجنور میں اس مجاہد کے نام کو ہر جگہ نا محمود لکھا گیا ہے۔ ہم نے اپنے قومی رہنما سید علیہ الرحمۃ کی روح پر فتوح سے معذرت کے ساتھ نا محمود کو محمود کر دیا۔

[3] زمانہ کا انقلاب ہے کہ جن لوگوں کو ہمارے قومی رہنما اور مصلحین مفسد اور لٹیرے لکھ گئے ہیں ان ہی کو آج ہم مجاہدین اور محبان وطن کے معزز القاب سے یاد کر رہے ہیں۔ شعر
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اس کے بعد جب احمد اللہ خاں کو انتظام حکومت سپرد ہو گیا تو
نے انگریزی افواج کے روکنے کے لئے مختلف مقامات پر اپنی فوجیں متعین
دارا نگر میں ماڑے خاں، قاضی عنایت علی اور دلیل سنگھ کو تعینات کیا
ان تینوں کے زیر کمان ۴۰۰ پیادہ اور ۶۹۸ سوار فوج تھی۔ یہ انتظامات
مارچ ۱۸۵۸ء میں کئے گئے تھے۔

انگریزی افواج مختلف مورچوں پر لڑتی اور ان کو سر کرتی بجنور
میں داخل ہو گئیں۔ ماڑے خاں خبر پاتے ہی دارا نگر سے مع اپنی افواج نگ
اور نگینہ کے باغوں میں مورچے قائم کئے اور احمد اللہ خاں کو بلانے کے
سوار بھیجے اور جتنی فوج کہ متفرق ہو گئی تھی اور جتنے باغی فرار ہو گئے
سب کو بلا کر جمع کیا۔ چنانچہ سب باغی یعنی ماڑے خاں، قاضی عنایت علی
سنگھ گوجر، احمد اللہ خان، شفیع اللہ خاں، حبیب اللہ خاں، کلن خاں
نتھو خاں متعین افضل گڑھ کل اپنی جمعیت اور توپوں کو لے کر بمقام
جمع ہو گئے۔ مگر محمود خاں نگینہ نہیں آیا بلکہ سیوہارہ میں جا کر مع ایک
توپ اور کچھ سواروں کے مقیم تھا۔

نگینہ کی لڑائی ۲۱ اپریل ۱۸۵۸ء کو ہوئی۔ مجاہدین پسپا ہو کر شہ
فیروز کے پاس مراد آباد چلے گئے۔

قاضی عنایت علی بھی شہزادہ فیروز کی فوج میں شامل ہو گئے یا نہ
اس کا حال "دسر کشی ضلع بجنور" سے معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ زبانی روایتوں
پتہ چلا ہے کہ وہ شہزادہ کے ساتھ مل کر بھی کچھ عرصہ تک انگریزوں کا

کرتے رہے، لیکن جب شہزادہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلا گیا تو قاضی صاحب مایوس ہو کر بھوپال کی طرف جہاں ان کے بعض اعزّا تھے روانہ ہو گئے، بھوپال پہنچکر نواب سکندر جہاں[1] بیگم کی ملازمت میں منسلک ہو گئے، تقریباً چھ ماہ رہنے پائے تھے کہ وہاں کے پولیٹیکل افسر کو ان کی موجودگی کا علم ہو گیا اس لئے وہ بھوپال چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

بھوپال سے چل کر آگرہ آئے۔ اس زمانہ میں ہائی کورٹ آگرہ میں تھی وہ نام بدل کر ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں عوام اور حکام پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا، لیکن بدقسمتی نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا ایک سال بعد جج کو معلوم ہو گیا کہ یہ تھانہ بھون کے قاضی عنایت علی خاں ہیں۔ وہ بھلا آدمی تھا اور قاضی صاحب کی قابلیت سے کافی متاثر ہو چکا تھا اس لئے اس نے ان کو پہلے ہی خطرہ سے آگاہ کر دیا اور رائے دی کہ:۔

"آگرہ سے کسی اور جگہ چلے جاؤ"

انہوں نے الور کا رخ کیا، راستہ میں مرض ضیق النفس لاحق ہو گیا، تاہم وہ الور پہنچکر مہاراجہ کی ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ سنا ہے کہ مہاراجہ الور نے

---

[1] علمائے ہند کا شاندار ماضی میں حکمران بیگم کا نام قدسیہ بیگم تحریر ہے جو یقیناً غلط ہے اس لئے کہ اس زمانہ میں بھوپال کی مسند پر سکندر جہاں بیگم رونق افروز تھیں، ان کا عہد ۱۸۴۴ء / ۱۲۶۰ھ تا ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۸ء / ۱۲۸۵ھ ہے۔

انہیں اپنا محافظ خاص مقرر کر لیا تھا۔

الور ہی کے دوران قیام میں ایک مرتبہ پوشیدہ طور پر تھانہ بھون آئے اور تین روز قیام کر کے واپس چلے گئے۔ الور میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں[1]۔ انتقال کے موقع پر مولانا شیخ محمدؒ کے بہنوئی حکیم شیخ احمد ریاست میں حاکم ضلع تھے، انہوں نے خفیہ طور پر تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ رات ہی میں چند آدمیوں نے نماز جنازہ ادا کی اور تاریکی شب میں دفنانے کے لئے لے چلے۔ اتفاق سے قبر مکمل ہونے میں دیر ہو گئی، اسی میں دن نکل آیا مسلمان سپاہیوں پر مشتمل کئی فوجی دستے ادھر سے گذرے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے نماز جنازہ ادا کی۔ پھر کچھ میواتی آئے انہوں نے جنازے کی نماز پڑھی اور قبر تیار ہونے پر جسد خاکی کو آسودۂ خاک کر دیا گیا، غرض جس شخص کی زندگی زیادہ تر ناکامیوں سے دوچار رہی تھی اس کا یہ شاندار انجام ہوا۔

روپوشی کا زمانہ

حضرت مولانا شیخ محمدؒ نے اس جہاد میں کس قدر حصہ لیا اس کے متعلق نہ کوئی زبانی روایت ملی اور نہ تحریری شہادت[2] تاہم قصبہ پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا تو اوروں کے ساتھ آپ کو بھی

---

[1] علماء ہند کا شاندار ماضی میں ان کا سنہ وفات ۱۹۱۰ء تحریر ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

[2] نسیم احمد فریدی امروہی، حکیم محمد عمر کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ آپ نے معرکہ شاملی میں حصہ نہیں لیا، اس تحریر سے بھی یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ جب انگریزوں کے حملے تھانہ بھون پر ہوئے اس وقت آپ مدافعین کے ساتھ شریک رہے یا نہیں۔

نکلنا پڑا۔ رام پور منہاران میں آپ کے کچھ رشتہ دار تھے جہاں دو تین سال تک روپوشی کی زندگی گذارتے رہے، آپ کا قیام اس حویلی میں تھا جو محل کے نام سے مشہور ہے اور بقول آپ کے: "وہ مکان اصل میں شیخ سالار صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا"

رام پور میں آپ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء تک مقیم رہے، وہاں سے کئی مرتبہ میرٹھ بھی جانا ہوا، لیکن غالباً گرفتاری کے ڈر سے ایک دفعہ بھی تھانہ بھون نہیں آئے، حضرت مولاناؒ نے تھانہ بھون سے جدائی کے ان ایام کو دورِ جلا وطنی سے تعبیر کیا ہے[1]۔ لیکن جلا وطنی اور روپوشی کا یہ زمانہ علمی مشاغل کے لئے نہایت سازگار رہا۔ ان ہی ایام میں آپ نے مثنوی معنوی دفتر ہفتم مکمل کیا، اور اسی زمانہ میں حزب البحر کی شرح لکھی۔ ایک اور تصنیف ارشاد محمدی بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ اس کو آپ نے مولوی فدا علی اور منشی محراب علی انوپ شہری کے ایما پر مرتب فرمایا۔

ٹونک میں قیام

۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء میں نواب وزیر الدولہ کے بلانے پر ریاست ٹونک تشریف لے گئے۔ اور وہاں نواب محمد علی کے جو اس وقت ولی عہد تھے استاد مقرر ہوئے۔

ٹونک میں حضرت مولاناؒ کئی سال مقیم رہے، آپ کے دوران قیام میں نواب وزیر الدولہ کا انتقال ہوا، ان کی جگہ نواب محمد علی مسند نشین ہوئے۔

---

[1] حضرت مولانا نے اس امر کا اظہار ۱۲۷۷ھ میں شرح حزب البحر کی آخری سطور میں کیا ہے۔

جب تک آپ ٹونک میں مقیم رہے نواب وزیر الدولہ اور ان کے بعد نواب محمد علی نے آپ کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ مہمان رکھا سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔ قیام ٹونک کے دوران ایک دلچسپ اور عبرت آموز واقعہ پیش آیا جو جزئی اختلاف کے ساتھ کئی طرح بیان کیا جاتا ہے، سب سے زیادہ معتبر و مستند روایت یہ ہے۔

"ایک ہندو راجہ نواب صاحب ٹونک کا دوست تھا، وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کرتا رہتا تھا، مذہب اسلام کو اچھی طرح جانچنے کے بعد وہ اس کی حقانیت کا قائل تو ہو گیا لیکن ایک وسوسہ اس کے دل میں ایسا قائم ہوا کہ اس کی وجہ سے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے ہچکچاتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ قرآن مجید واقعی خدا کا کلام ہے تو اس کا اثر پڑھنے اور سننے والوں پہ ہونا چاہیے، لیکن مسلمان رات دن اس کا ورد کرتے ہیں پھر بھی ان پہ رنج و خوشی اور وعید و نوید کی آیتوں کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اس کو الہامی کتاب کیسے کہا جا سکتا ہے۔

ایک مرتبہ نواب صاحب کے سامنے بھی اس نے اپنے اس وسوسے کا اظہار کیا۔ نواب صاحب نے اس کو حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے اس بات کا اس وقت کوئی جواب نہیں دیا اور اس راجہ سے جمعہ کے روز نہا دھو کر اور پاک و صاف

کپڑے پہن کر آنے کو کہا، آپ کے ارشاد کے بموجب وہ راجہ
جمعہ کے دن حاضر خدمت ہوا، آپ نے اس کو سامنے بٹھا کر
سورۂ "ق" کی تلاوت فرمائی جس کو سنکر وہ لوٹنے اور تڑپنے
لگا، جب آپ تلاوت سے فارغ ہوئے تو وہ دوڑ کر آپ
کے قدموں پر گر پڑا اور فوراً مسلمان ہو گیا، اس کے استفسار
پر آپ نے فرمایا کہ:-

قرآن مجید یقیناً کلام اللہ ہے، لیکن یہ ان ہی لوگوں کے
دلوں پر اثر کرتا ہے جن میں تقویٰ و طہارت ہے، فی زمانہ
مسلمانوں کے قلوب دنیوی آلائش سے ایسے ملوث
ہو گئے ہیں کہ نور ہدایت کی کرنیں ان میں نفوذ نہیں کر سکتیں"

ٹونک سے واپسی حضرت مولانا شیخ محمدؒ ۱۲۸۲ھ کے آخر یا ۱۲۸۳ھ[1] کے
شروع میں ٹونک سے تھانہ بھون تشریف لے
گئے۔ ٹونک کے دوران قیام میں آپ کے پاس گورنمنٹ ہند نے بحال باغیان
قصبہ تھانہ بھون کے نیلام کا اشتہار بھیجا تھا۔ نیلام کی زد میں آپ کی اپنی جائیداد

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ ۱۲۸۰ھ میں
ٹونک سے تھانہ بھون تشریف لے آئے تھے، لیکن اس سنہ کی صحت پر اس
لئے شبہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کے دو صاحبزادے ۱۲۸۲ھ میں ٹونک میں
پیدا ہوئے تھے اور اس وقت آپ کا قیام وہیں تھا۔

بھی آگئی تھی۔

حضرت مولانا نے وطن واپس آکر گھیر کا وہ محل جس میں قاضی عنایت علی کا قیام تھا اور کچھ صحرائی جائداد انیس ہزار روپے میں خرید لی اور زرچہارم خزانہ میں داخل کر دیا، لیکن کلکٹر نے دوسرے دن قیمت میں تھوڑا سا اضافہ کر کے وہ پوری جائداد ایک بنئے کو دیدی، آپ نے مقدمہ لڑا یا اس میں جیت گئے۔ روپیہ کی ادائگی میرٹھ کے ایک مہاجن سے قرض لے کر کی گئی پھر اس مہاجن کا قرضہ نواب محمود علی صاحب رئیس چھتاری سے قرض حسنہ لے کر اور جائداد کو ان کے پاس مکفول کر کے ادا کر دیا۔ لیکن نواب صاحب کے کارندوں کی سازشوں سے معاملات بگڑ گئے۔ انہوں نے فرشتہ صفت نواب کو کچھ غلط باتیں بنا کر حضرت مولانا سے بدظن کر دیا۔ نواب صاحب نے تین چوتھائی جائداد نیلام کرا کر خود خرید لی۔ حضرت مولانا نے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا، آخر کار نواب صاحب کی فطری نیکی غالب آ گئی، انہوں نے حضرت مولانا کو چھتاری بلا کر اپنی تقصیر کی معافی چاہی اور تمام جائداد واپس کر دی لیکن عدالتی کارروائی کی تکمیل حضرت مولانا کے وصال کے بعد ہوئی۔

اسی مقدمہ کے دوران دو مرتبہ آپ کو چھتاری جانا پڑا۔ دوسرے سفر میں آپ بیمار ہو گئے اور یہی بیماری مرض الوفات ثابت ہوئی۔

یہ مقدمہ حضرت مولانا کے لئے طرح طرح کی آزمائشوں کی کسوٹی بن گیا، آپ ان آزمائشوں میں ثابت قدم رہے۔ نہ آپ نے روپے پیسے کی پرواکی نہ مال و املاک کے جانے کا غم کیا اور نہ خوشامد و آمد سے کبھی اپنا کام

نکالنے کی کوشش کی۔[1]

آخری ایام مرض الوفات اور وصال

حضرت مولاناؒ کے آخری ایام میں جائیداد کا قضیہ برابر چلتا رہا۔ لیکن اس کی وجہ سے آپ کے دیگر مشاغل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی درحقیقت مقدمہ میں آپ نے عملی طور پر بہت کم حصہ لیا۔ زیادہ تر کام آپ کے مریدین ہی نے انجام دیا۔ بعض اوقات تو آپ کو محض دستخط ہی کرنے پڑے باقی کارروائی مریدین نے خود ہی پوری کر دی، اس پر بھی کئی بار آپ نے فرمایا:۔

میاں! کہاں کا قضیہ ہے دور بھی کرو،،

لیکن وہ خیر خواہ آخر وقت تک اس معاملہ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوئے بہر کیف حضرت مولاناؒ تمام نتائج و عواقب کی پروا کئے بغیر تصنیف و تالیف ذکر و فکر اور مجاہدہ و مکاشفے میں مشغول رہے۔ کئی مرتبہ مختلف مقامات کا سفر بھی کیا۔ نواب محمد علی والی ٹونک معزول کر کے بنارس بھیج دیئے گئے تو وہاں ان سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے، بارہا میرٹھ گئے۔ حیدر آباد سے بھی بعض معتقد عمائد نے آپ کو بلایا لیکن اس لئے تشریف نہیں لے گئے کہ وہاں کے بعض علماء حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کو برا کہتے تھے۔

آپ کی آخری دور کی تصنیفات "انوار محمدی،، اور حاشیہ بر سنن نسائی ہیں، سب سے آخری تحریر ایک استفتا کا جواب تھا جو "سماع موتیٰ،، کی تحقیق

---

[1] تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء۔

کے بارے میں آپ نے حکیم محمد عمر سے لکھوا کر بھجوایا تھا۔

نسائی پر حاشیہ لکھنے سے پہلے ہی آپ کی طبیعت علیل ہو گئی تھی۔ رجب ۱۲۹۵ھ میں لرزہ اور بخار آنے لگا تھا، حکیم محمد عمر صاحب نے علاج کیا افاقہ ہو گیا مگر مرض کا پوری طرح ازالہ نہیں ہوا۔ اسی حالت میں آپ نے رمضان شریف میں قرآن شریف سنایا، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ آئندہ سال ماہ صیام تک حیات مفہوم نہیں۔ حکیم صاحب نے جب فرمایا:۔

نہیں حضرت کمزوری ہے انشاءاللہ رفع ہو جائے گی"!

تو آپ ہنس کر خاموش ہو گئے۔

طبیعت ذرا سنبھلی تو نہایت تیزی سے نسائی کا حاشیہ لکھا اور اسے بہت جلد مکمل کر دیا۔ پھر جرتھاول ہوتے ہوئے چھتاری تشریف لے گئے وہیں مرض الوفات لاحق ہو گیا۔ خدام نے وہاں سے لا کر چار روز میرٹھ میں رکھا۔ اور علاج کیا۔ جب افاقہ نہ ہوا تو تھانہ بھون لے آئے۔ علاج ہوتا اور مرض بڑھتا رہا۔ آخرش وہ وقت آن پہنچا جس سے کسی ذی حیات کو مفر نہیں۔

۴ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۷۹ء بروز منگل قمری سنہ کے حساب سے ۶۷ سال اور شمسی سنہ کے مطابق ۶۴ سال کی عمر میں آپ نے دار فانی سے دار باقی کی جانب رحلت فرمائی۔ آخری لمحات کا نقشہ آپ کے مرید خاص حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

جناب مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روح پرواز کرنے کے وقت یہ خاکسار بھی موجود تھا۔ عین حالت نزع اور رحلت فرمانے میں ذکر سلطان الاذکار اور پاس انفاس زبان مبارک پر جاری

معلوم ہوتا تھا، قریب نصف شب کے روح پر فتوح نے
اپنے مقام اصلی کی راہ لی اور اپنے محبوب حقیقی سے جا ملی
انّا للہ و انّا الیہ راجعون[۱]،،

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں آپ کے مرض وفات اور وصال کی وہ تفصیلات بھی درج کردی جائیں جو مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی نے حکیم محمد عمر چرتھاولی کے حوالہ سے بیان فرمائی ہیں :۔

وسط ربیع الاول میں آپ پھلتاری تشریف لے گئے۔ راستہ میں چرتھاول میں بھی ایک رات قیام فرمایا۔ چرتھاول میں جب شرح نسائی کا ذکر آیا تو کچھ اس قسم کے کلمات حسرت آیات فرمائے کہ سامعین کے قلب و جگر پاش پاش ہو گئے صبح ہی وہاں سے پھلتاری کے لئے سوار ہو کر روانہ ہوئے اور شام تک وہاں پہنچے۔

چونکہ حالت ضعف میں یہ طویل سفر کیا تھا۔ اس لئے تکان کے باعث رات کو بخار آگیا، نواب صاحب کے اصرار پر پانچ چھ روز وہاں رہنا ہوا، دوا اور پرہیز کچھ نہ تھا۔ وعظ بھی کہنا پڑا، بخار بدستور رہا، بلکہ بڑھتا رہا، حتیٰ کہ جب

---

[۱] وفات کی شب ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ جامع مسجد دہلی کا دایاں مینار گر گیا ہے، ایک اور بزرگ نے خواب ہی میں حضرت رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں پوچھا تو فرمایا کہ یہ مولوی شیخ محمد آنے والے ہیں ان کو لینے کے لئے تشریف لائے ہیں رسالہ عطاء المنان۔

آپ واپسی میں میرٹھ اترے تو طبیعت بہت ناساز ہوگئی، رات بھر نیند نہ آئی، صبح کو احباب کے کہنے سے دوا لی۔ دوپہر تک طبیعت کچھ اچھی رہی، پھر یکایک بخار بڑھ گیا اور ساتھ ہی ذات الجنب ہو گیا اس میں خشکی و تشنگی و ضیق النفس اور کھانسی کی زیادتی ہوگئی، بے ہوشی اور غفلت بھی رہنے لگی، تین چار روز شہر میرٹھ کے طبیبوں کا معالجہ کیا گیا، پھر حکیم عبدالغفور صاحب سکندر آبادی آگئے ان کا نسخہ دیا گیا۔ ۲۰ ربیع الاول کو سہ پہر کے وقت منشی غلام حسین ہاپوڑی کو بلا کر فرمایا کہ آج کی رات میرے پاس بیٹھے رہنا انشاء اللہ اس کے صلے میں تم کو کوئی نفع خاص پہنچے گا۔ چنانچہ بسر و چشم حاضر رہے، اس کے بعد آپ کو تھانہ لے جایا گیا۔ طبیعت بدستور ناساز رہی، شب وفات سے پہلے جو پیر کا دن آیا تو آپ نے کچھ سنبھالا لیا۔ اسی دن مولانا محمد محمود صاحب جو ریاست ٹونک میں ناظر تھے حسب الطلب آگئے۔ حکیم محمد عمر صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میاں محمود بخیر و عافیت آپہنچے، سنتے ہی فرمایا بس تو آج ہی تک کا قصہ تھا اتنے میں میاں محمود نے حاضر خدمت ہو کر سلام عرض کیا۔ حضرت نے حکیم صاحب سے فرمایا:۔

> اچھا فقیر کی چارپائی درست کردو، اور خوب دیکھ بھال کر روبہ قبلہ بچھا دو، سب کو سمجھا دو کہ جہاں تک فقیر کا سامنا ہے ادھر سے کوئی شخص نہ آنے پائے اور اس وقت میری مجلس میں کسی ایسے شخص کی آمد و رفت نہ ہونے پائے جو مخالف ملتِ حضرتِ شفیع محشر ہو۔"

پھر فرمایا:

"دیکھو کھانا تیار ہو گیا ہو گا، جلد منگالو اور تم اور محمود مع اور سب صاحبوں کے ایک جگہ بیٹھ کر کھالو۔"

المختصر بارہ بجے دن سے پہلے پہلے یہ تمام انتظام فرما چکے تھے، سب مہمانوں نے کھانا کھالیا، چونکہ سوائے دوا یا پانی کے سترہ اٹھارہ دن سے کچھ کھایا پیا نہ تھا، نہایت لاغر و ناتواں ہو گئے تھے، مگر پاس انفاس اس حالت میں بھی برابر جاری رہا، شروع زمانہ ذکر و شغل میں جاگتے، سوتے، سوار، پیادہ، ارادہ بلا ارادہ پاس انفاس جاری رہتا تھا، اسی شدت مرض کے زمانہ میں ایک دن فرمایا کہ "فقیر اس کے ترک کی قدرت نہیں رکھتا، دم بھر کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

جب دن چڑھا، ایک دورہ پڑا جس سے تنفس بڑھ گیا، آپ نے آہستہ آہستہ کچھ پڑھا اور حکیم صاحب سے فرمایا:

"دو مونڈھے منگالو اور میری چارپائی سے جانب قبلہ اپنا مونڈھا اور جانب شرق محمود کا مونڈھا ڈالو اور دونوں جانب تم دونوں بیٹھ جاؤ اور کچھ دیر میرا حال دیکھو۔"

تعمیل ارشاد کی گئی، اس کے بعد لمبے سانس کے ساتھ "اللہ" کہا اور آنکھیں بند کئے بیس منٹ تک بے حس و حرکت لیٹے رہے اور پھر آنکھیں کھول کر میاں محمود سے مخاطب ہو کر فرمایا "کچھ دیکھا؟" انہوں نے عرض کیا "شاید نیند کا اثر تھا" فرمایا "نہیں" بعدہٗ حکیم صاحب سے فرمایا "بھلا کیا بات تھی؟" انہوں نے عرض کیا "شاید حضرت کی توجہ خداوند قدوس کی جانب تھی۔" فرمایا "ہاں۔"

دن کے ایک بجے کا وقت تھا کہ سلطان الاذکار کے اندر مشغول ہو گئے۔ ہر سانس کی آمد و شد سے لفظ "اللہ" صاف صاف نکلنے لگا۔ شام کے وقت مجلس حضرت میں اہل شہر کا ایک کثیر مجمع ہو گیا۔ پاس انفاس اور سلطان الاذکار کی کیفیت یہاں تک بڑھی کہ ہر واقف و ناواقف پر بھی ظاہر ہو گئی، متولی عبدالرحمن تھانوی نے بصد نالہ و فغاں کہا:

"افسوس! آج یہ آفتاب عالمتاب چھپا چاہتا ہے"

بقول حکیم محمد عمر صاحب:۔ اس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا ایک میدان وسیع میں صدہا اولیاء اللہ اور ہزاروں صوفیائے با صفا جہر کے ساتھ ذکر اللہ کر رہے ہیں اور ہر طرف سے "اللہ اللہ" کی صدا آرہی تھی" ساڑھے گیارہ بجے رات تک یہ کیفیت رہی اور جب نصف شب گذر گئی دفعتہً مغرب کی سمت سے ایک آندھی اٹھی اور بادل چھا گیا۔ اسی وقت روح پرفتوح عالم بالا کی جانب رخصت ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جیسے ہی حضرت نے انتقال فرمایا پہلے تو سخت زلزلہ آیا۔ پھر دیر تک بادلوں کا شور اور آندھی کا زور رہا۔ آپ کی وفات کی وجہ سے جہاں زمین لرزاں تھی اور آسمان گریاں وہاں تمام حاضرین کے دل و جگر بریاں تھے، بہت سے لوگوں نے رات ہی سے قرآن مجید اور کلمہ توحید بطور ایصال ثواب پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے بہت سے ناظرہ خوان اور حافظ قرآن جمع ہو گئے اور سب تجہیز و تکفین، قرآن کی تلاوت اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہے۔ ۷ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ کو منگل کے دن دس بجے کے قریب عید گاہ کے نزدیک نماز جنازہ پڑھی

گئی، شہر کے مسلمانوں کے علاوہ دور دور کے لوگ شریک جنازہ ہو گئے تھے حالانکہ اس وقت تک ریل اس علاقہ میں جاری نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود ایک بڑا مجمع پیدل اور سواری سے شرکت جنازہ کے لئے تھانہ بھون پہنچ گیا تھا۔ اتفاقاً گورکنوں کی غلطی سے قبر کی تیاری میں دو گھنٹہ کی دیر ہو گئی اس عرصہ میں آپ کے خلیفہ مجاز حضرت قاضی سید محمد اسمٰعیل منگلوری بھی آ گئے غرض دوپہر سے پہلے سپہر علم و عرفان کا یہ آفتاب نیمروز زیر زمین غروب ہو گیا[1]

تاریخ وفات کا ایک مادہ آیۃ کریمہ :-

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا

اور دوسرا وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ کا لفظ

"غَيْرَ بَعِيْدٍ" ہے۔ ان کے علاوہ کئی مادے حکیم محمد عمر تھانوی نے نکالے تھے

(۱) کیا قطب ارشاد نے انتقال آہ (۱۲۹۶ھ)

(۲) اے عمر فکر سن رحلت مغفور ہے گر — کر شمار عدد شیخ محمد مرحوم
۱۲۹۶ھ

(۳) رنج و الم شد چرا جان و جگر چوں فشرد — عارف انہ سنتی بگو شیخ محمد نمرد
۱۲۹۶ھ

یہ تاریخ بھی حکیم صاحب نے کہی تھی :-

دیدۂ صوری سے دیکھو معنوی سے خواہ عمر — تھا عدد بارہ سو ننانوے پر بڑھے تھے آہ کے

---

[1] تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء

چند اور حضرات کے مادّے بھی قابلِ غور ہیں :۔

(۱) ہائے افسوس چراغ گل ہوگیا (۱۲۹۶ھ)

(۲) قطب ارشاد رفت (۱۲۹۶ھ)

(۳) ھو غفرلہٗ (۱۲۹۶ھ)

انتقال کے وقت ایک عجیب واقعہ

جس روز رات کو تھانہ بھون میں آپ کا وصال ہوا اسی دن ریاست جھالاوار میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

"کچھ لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے، دیکھتے کیا ہیں کہ بے شمار آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لئے نہایت تیزی سے کسی طرف جا رہے ہیں، کھیت میں کام کرنے والے ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ "اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہو!" ان میں سے ایک نے جواب دیا "تمہیں معلوم نہیں، تھانہ بھون میں حضرت مولانا شیخ محمد کا انتقال ہو گیا ہے ہم ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں!"

تھوڑی دیر میں وہ مجمع آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، لیکن صبح کو دیکھا گیا کہ بہت سی مشعلیں بجھی ہوئی کھیتوں میں بکھری پڑی ہیں!"

اس راز کو نہ اس وقت کوئی سمجھ سکا تھا اور نہ یہ معمہ اب سمجھنے یا سمجھانے کا ہے بزرگوں کی باتوں اور ان کی کرامتوں کو بزرگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

آپ کے مزار کی حالت

حضرت مولاناؒ کا مزار پر انوار بھاتہ کھیولی میں شاہ ولایت صاحب کے مزار کے قریب واقع ہے قبر کا تعویذ کچا ہے، البتہ قبر کے چاروں طرف اینٹوں اور گچ کا چبوترہ بنا کر اس کو محفوظ کر دیا گیا ہے، بالیں پر کوئی کتبہ نصب نہیں، اس لئے جب تک کوئی بتانے والا نہ ہو مزار کا پتہ چلانا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

علم وفضل اور شمائل وخصائل

حضرت مولانا شیخ محمدؒ ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس میں علم متوارث تھا، غالباً قانون توارث کو پیش نظر رکھ کر بعض حضرات آپ کے شوق علمی کو جدی میراث کہہ دیں گے، لیکن جب یہ حقیقت سامنے رکھی جائے کہ کئی پشتوں تک اس خاندان میں حضرت مولانا جیسا دوسرا عالم نظر نہیں آتا تو پھر لامحالہ یہ نتیجہ نکالنا پڑے گا کہ آپ کو قدرت نے غیر معمولی طور پر فہم وذکا اور فہانت و فطانت سے سرفراز فرمایا تھا۔ صاحب نزہۃ الخواطر کی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے۔ وکان مفرط الذکا، سریع الادراک، قوی الحفظ حلو الکلام حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت مولانا کو علم وحکمت کے لئے بے پایاں صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ آپ کی زندگی میں وہی شان نظر آتی ہے جو دیگر علماء اور اکابر کی زندگیوں میں دکھائی دیتی ہے، جو چیزیں عام آدمی سالہاسال کی محنت شاقہ کے باوجود نہیں سمجھ سکتے ان کو آپ کا ذہن نہایت جلد اخذ کر لیتا تھا، پھر آپ کو کسی ایک علم سے ہی مناسبت نہیں تھی بلکہ جملہ علوم معقولات

ومنقولات میں تبحر حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ نہایت زود نویس اور خوش قلم بھی تھے۔ حضرت مولانا فتح محمد تھانوی کی تحریر سے آپ کی علمی قابلیت کا ایک واضح خاکہ ہماری نگاہ تصور کے سامنے آجاتا ہے۔

"اور علم و فضل میں شہرۂ آفاق ہونا ایسا نہیں کہ محتاج بیان ہو، مشتے نمونہ از خروارے عرض کرتا ہوں۔ حافظ کلام اللہ، محدث صوفی صافی، علم حدیث میں مہارت تامہ اور علم تفسیر میں وہ ملکہ کہ کشاف اور بیضاوی اور عالم بمنزلہ از برتھی اور لغت دانی کا تو حال کہ اگر حافظ قاموس اور ستنا اور صحیح البحار کہا جائے تو عجب نہیں اور خود محقق ایسے ہوتے کہ جس لغت کے درپے ہوں سہندی کی چندی کی نوبت پہنچا دیں اور علم فقہ میں وہ کمال کہ علاوہ اصول کے فروعات اور جزئیات پر نظر کہ سائل کے دل کی تشفی ہو جاتے اور علم الکلام میں ید طولیٰ، علم و معانی اور بیان کا کیا بیان علم ادب میں کچھ کہا نہیں جاتا۔"

غرض علم سے فطری لگاؤ تھا، تمام عمر علمی مشاغل جاری رہے، علماء کی صف میں ہمیشہ ممتاز سمجھے جاتے رہے اور ہر زمانہ کے اکابر نے آپ کی اس حیثیت کو تسلیم کیا۔

علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علم باطنی کی طرف بھی آپ کا رجحان اوائل عمر ہی سے تھا، چنانچہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر بعمر سات سال بیعت

کی۔ پھر جب حضرت میانجیو نور محمدؒ کی بزرگی کا نقش دل پر جم گیا تو ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے میں تامل نہیں کیا، حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی، اس ذاتی شوق و ولولہ اور تڑپ کے ساتھ بزرگوں کی نظر فیض اثر نے مل کر آپ کو بہت جلد علم باطنی کے بھی اعلیٰ مدارج پر فائز کر دیا اور آپ کے مرشدوں نے آپ کے علوئے مراتب کی تصدیق کی۔ ایک طرف حضرت میانجیو نور محمدؒ کا آپ کے متعلق یہ ارشاد :۔

"معارف ربانیہ کا پہچاننے والا اور حقائق کا تحقیق کرنے والا ہے"

اور دوسری جانب حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب کا یہ فرما دینا :۔

"تمہاری نسبت میں بڑی فراخی اور وسعت ہے اور تمہیں اب کچھ احتیاج اکتساب باقی نہیں"

دو ایسی وقیع شہادتیں ہیں کہ ان کے بعد آپ کی تحصیل و تکمیل باطنی کے لئے مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔

دونوں قسم کے علوم کے جامع ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا کی عملی زندگی شریعت و طریقت کے امتزاج کا ایک اچھا نمونہ تھی، بعض نام نہاد صوفیوں کی طرح آپ نے کبھی شریعت کو حقیر نہیں سمجھا بلکہ طریقت کے لئے شریعت کو ضروری قرار دیتے رہے، شریعت کا احترام جیسا اور بزرگان دین کو ملحوظ تھا ویسا ہی حضرت مولانا کے دل میں بھی عمر بھر قائم

رہا، سلوک کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہونے کے باوجود آپ نے عبادات کی جانب سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ بلکہ اس معاملہ میں اتنا اہتمام رکھا کہ نہ صرف اپنا تہجد کبھی قضا نہیں ہونے دیا بلکہ اپنے مریدین کو بھی سختی سے اس کی تاکید فرماتے رہے۔ نسیم احمد صاحب علوی جھنجھانوی نے "نور محمدی" میں حضرت میانجیو نور محمدؒ کے وصال کا ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے ایک طرف حضرت میانجیوؒ کی کرامات کا علم ہوتا ہے تو دوسری جانب حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے تقویٰ و تقدس پر روشنی پڑتی ہے لکھتے ہیں

> پیرجی محمد صادق صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ سے بیعت ہونے کے بعد بارہ سال تک حضرت کے بتلائے ہوئے اوراد وغیرہ پر پابندی کرتے رہے، بارہ سال کے بعد ایک روز نماز تہجد قضا ہوگئی، صبح کو اس کا تذکرہ حضرت مولانا صاحب سے کیا، آپ کو نماز تہجد کا قضا کرنا بہت ناگوار گزرا اور حکم دیا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ہمارے یہاں تمہارا کام نہیں چلے گا۔ آپ حسب الحکم پیر ومرشد گھر آگئے اور دل میں طے کرلیا کہ اپنے بڑوں کے یہاں یعنی حضرت میانجیوؒ کے مزار اقدس پر حاضر ہوں۔ خرچ کے لئے زاد راہ جو دیکھا، دو پیسے نکلے، ان میں سے ایک پیسہ کا ستو اور ایک پیسہ کی شکر لے کر روانہ ہوئے۔ حضرت کے مزار پر پہنچکر اس ستو کو پانچ وقت کیا۔ چھٹے وقت کھانے کیلئے

کچھ پاس نہ رہا، آپ حضرت کے مزار مبارک سے لپٹ کر بہت روئے، شب میں حضرت میاںجیو کو خواب میں دیکھا، فرما رہے ہیں:۔

"محمد صادق! لے اپنے دو پیسے جو تیرے خرچ ہوتے ہیں"

آنکھ کھلی تو ہاتھ میں دو پیسے تھے۔ صبح کو میں حضرت میاںجیو رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف کی مسجد میں تھا کہ ایک صاحب نے آکر یہ آواز دی:۔

"مسجد میں کوئی محمد صادق صاحب ہیں؟"

میں پہنچا، وہ آنے والے ایک خوان میں کھانا لئے ہوئے تھے جو گرم تھا، فرمایا کہ رات خواب میں چچا صاحب نے فرمایا کہ:۔

"ہمارے یہاں مہمان تین روز سے آئے ہوئے ہیں، ان کے دو پیسے جو خرچ ہوگئے تھے وہ تو ہم نے ان کو دیدیئے ہیں، لیکن وہ رات سے بھوکے ہیں، ان کو کھانا کھلاؤ، میں کھانا کھا کر نماز چاشت پڑھ کر فارغ نہیں ہوا تھا کہ گاڑی کے گھنگھرو کے بجنے کی آواز آئی کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تشریف لے آئے ہیں اور فرمایا، "محمد صادق! ہمارے ساتھ چلو، رات حضرت میاںجیو نے خواب میں فرمایا ہے تم اس کو لے آؤ، ہمارے یہاں سختی نہیں ہے بلکہ اللہ کے فضل و کرم پر بھروسہ ہے"

(بروایت قاضی ظفر احمد صاحب قاضی شہر سہارنپور)

غرض اتباع شریعت کا اس قدر خیال تھا کہ اس میں غیر معمولی سختی تک کو روا رکھتے تھے، لیکن عام طور پر آپ کے رویہ میں بہت نرمی تھی، شریعت و طریقت

کے امتزاج نے مزاج میں حسن اعتدال پیدا کر دیا تھا، آپ کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ جو شخص حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ایک لمحہ کو بھی آپ سے جدا ہو، کلام میں ایسی شیرینی تھی کہ جو سنتا تھا اس کی طبیعت نہیں بھرتی تھی، یہی چاہتا تھا کہ گفتگو میں اور بسط و شرح ہو،[1] باتیں سادہ اور عام فہم زبان میں کرتے تھے، البتہ وعظ کہتے وقت مشکل الفاظ اور دقیق اصطلاحات استعمال کر جاتے تھے، لیکن ان کی تشریح بعینی سے کرتے جاتے تھے۔[2]

حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ آپ کے شمائل و خصائل کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:-

"باوجودیکہ سن شریف ساٹھ سے متجاوز ہو گیا تھا، مگر رونق چہرہ اور جمال صورت میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ اور خوش آوازی تو غضب ہی تھی، کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ کو جس لہجہ اور ادا سے پڑھتے تھے ذوق اس کا سننے والے ہی جانتے تھے اور خوش تقریری اور وعظ گوئی اور اس کی تاثیر کی وہ کیفیت

---

[1] ترجمہ شرح حزب البحر [2] آپ کے متعلق ارواح ثلثہ میں ایک حکایت اس طرح درج ہے:- حکایت (۲،۳) فرمایا کہ مولانا شیخ محمد صاحب وعظ میں لغات بہت بولتے تھے اور اس کی تفسیر بعینی سے کرتے تھے، ایک مرتبہ مولانا میرٹھ تشریف لے گئے تو ایک شخص کی نسبت دریافت کیا کہ یہ کیا یہہ میرٹھ سے ہیں یا اجانبش میرٹھ سے ہیں؟"

دیکھی میں نے کہ ہر طرف سے آواز آہ و نالہ کی آتی تھی، اور ہا و ہو کا غل مچ جاتا تھا، تصوف اور سلوک میں وہ دسترس کہ بیان نہیں ہو سکتی، توجہ کی وہ تاثیر جو سامنے بیٹھا ادنیٰ اشارہ میں لوٹا اور نعرہ مارا یا سر پیٹنا شروع کیا۔"

مولانا نصر اللہ خورجوی حضرت میانجیو نور محمدؒ کے تینوں خلفاء کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں: ۔

حالات سہ کس بزرگ در یاران ایشان (میانجیو نور محمد) حاجی امداد اللہ صاحب، حاجی مولوی شیخ محمد صاحب و حافظ غلام[1] ضامن با نسبت و با مذاق فقیر مستند، و عالم بہ صحبت ایشان رسیدہ بہ ذوق درویشی می رسد۔ صحبت این بزرگواران حکم اکسیر دارد۔

رباعی: ۔

آہن کہ بہ پارہ آشنا شد ؛؛ فی الحال بہ صورت طلا شد
خورشید نظر چو کرد بہ سنگ ؛؛ تحقیق کہ لال بے بہا شد

عجب مجمع این عزیزان در تھانہ است، خداوند تعالیٰ باقی دارد و جہانی را بہ فیضان محمدی از سینہ ایشان برساند۔"

اور بھی بہت سے علماء اور اکابر نے حضرت مولاناؒ کی بزرگی و برتری کا اعتراف کیا ہے

---

[1] صحیح نام حافظ محمد ضامن علی شاہ ہے۔

چنانچہ حضرت سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:۔

"ہمارے اکابر حضرات میں حضرت مولانا شیخ محمد صاحب بڑے بلند پایہ بزرگ ہوتے ہیں"

ازدواج و اولاد

حضرت مولانا شیخ محمدؒ نے چھ شادیاں کیں[1] پہلی شادی حضرت میانجیوؒ کے وصال سے پہلے ۱۲۵۲ھ میں ہو چکی تھی، اس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ حضرت کے اس قول سے ہوتا ہے:۔

"تم مجرد تھے اور حافظ صاحب و شیخ محمد صاحب عیالدار"

آپ کی دوسری شادی ۱۲۶۲ھ میں بی حمیدہؒ سے ہوئی۔ بی عائشہ بنت قاضی سعادت علی اور بی فاطمہ ۱۲۷۱ھ میں بی حمیدہؒ کے انتقال کے بعد ایک ساتھ آپ کے حبالہ عقد میں آئیں، موخر الذکر قاضی محبوب علی کی بھانجی اور نابینا تھیں، آخر میں دو اور بیوہ عورتوں سے شادی کی۔ اولاد صرف تین بیویوں سے ہوئی۔ بی حمیدہؒ، بی عائشہ اور بی فاطمہ سے۔

بی حمیدہؒ ۱۲۷۱ھ تک زندہ رہیں، ان کے ایک صاحبزادہ اور ایک صاحبزادی تھیں، صاحبزادہ کا نام محمد محمود تھا، وہ حضرت مولانا شیخ محمد کے خلف اکبر تھے اور انہی کی نسبت سے آپ کی کنیت ابو محمود ہوئی۔ ۱۵ شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۲۹

---

[1] جن عورتوں کو آپ اپنے حبالۂ عقد میں لائے ان میں چار بیوہ اور ایک نابینا تھیں گویا اس معاملہ میں بھی آپ نے رسول صلعم کی پیروی کا خیال رکھا یہ تھا آپ کا اتباع سنت۔

کو پیدا ہوئے اور ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ مطابق جولائی ۱۹۳۶ء میں تھانہ بھون میں فوت ہوئے۔ ان کی پہلی شادی حضرت مولانا محمد احسن نانوتوی رح کی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے تین صاحبزادے محمد اعلیٰ، محمد افضل اور محمد مسعود اور ایک صاحبزادی امۃ فضل پیدا ہوئیں۔ امۃ فضل قاضی عبدالغنی صاحب منگلوری سے منسوب تھیں، مولوی محمد محمود صاحب مرحوم کی تیسری بیوی پانی پت کی ایک نیک اور سیدھی سادی خاتون تھیں۔ آشوب ۱۹۴۷ء میں لاہور پہنچکر فوت ہوئیں ان کے ایک صاحبزادی امۃ رحیم اور ایک صاحبزادے محمد احمد ہیں، دونوں پاکستان میں موجود ہیں۔

بی حمیدؔا کی صاحبزادی مقصود النساء تھیں وہ ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ مطابق ۸ نومبر ۱۸۵۹ء کو قصبہ رام پور منہاران میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی مطبع مجتبائی کے موسس و مالک مولوی عبدالاحد مرحوم سے ہوئی تھی۔ ان کی اولاد میں دو صاحبزادے عزیز اور احمد اور پانچ صاحبزادیاں حمیدہ، رشیدہ، صغریٰ امت الرحمٰن اور محمودہ تھیں، اول الذکر صاحبزادی خان بہادر محمد سلیمان سابق چیف انجنیر سے منسوب ہیں، اور اس وقت لاہور میں مقیم ہیں، صغریٰ اور امت الرحمٰن یکے بعد دیگرے محمد افضل ابن مولوی محمد محمود بن حضرت شیخ محمد سے منسوب ہوئیں اور محمودہ کی شادی محمد اعلیٰ خلف مولوی محمد محمود سے ہوئی تھی۔

بی عائشہ کے صاحبزادے مولانا محمد عمر صاحب تھے، ان کی ولادت ۲۲ شوال المکرم ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) بروز شنبہ ملبدہ دار الاسلام محمد آباد عرف ٹونک میں ہوئی

وہ اپنے بزرگ باپ کے صحیح جانشین تھے، انہوں نے بعض کتابیں حضرت مولانا فتح محمد سے پڑھی تھیں، بعدہٗ علوم متداولہ کی تکمیل دہلی جاکر کی۔ قاضی اسمٰعیل منگلوری (ف ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء) سے خرقہ خلافت حاصل کیا، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور حیات مستعار کی محض ۳۷ بہاریں دیکھ کر ماہ رمضان المبارک ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں واصل رحمت حق ہوئے۔ ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں دوسری اہلیہ مسماۃ مبارک النساء اور چاروں صاحبزادیاں امۃ المنان[1]، امۃ الرحمٰن[2]، امۃ الرحیم اور امۃ الکریم کراچی اور حیدرآباد میں مقیم ہیں۔

مولانا محمد عمر مرحوم کی حقیقی ہمشیرہ میمونۃ النساء تھیں وہ یکم شوال ۱۲۸۰ھ/۱۰ مارچ ۱۸۶۴ء کو بلدہ دارالاسلام ٹونک میں پیدا ہوئیں اور ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء کو میں تھانہ بھون میں فوت ہوگئیں۔ ان کی نسبت قاضی عنایت علی کے صاحبزادہ مومن سے ہوئی تھی، لیکن کتخدائی سے پہلے دونوں فوت ہوگئے۔

حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی تیسری اہلیہ بی بی فاطمہ کے صرف ایک صاحبزادے محمد صدیق تھے، وہ بھی بلدہ دارالاسلام ٹونک میں ۲۳ رمضان المبارک ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے اور بعمر ۲۸ سال ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں بمقام تھانہ بھون فوت ہوگئے ان کی شادی متولی محمد اسمٰعیل کاندھلوی کی دختر امۃ الباقی سے ہوئی تھی جن سے صرف ایک صاحبزادی امۃ کلثوم پیدا ہوئیں، وہ متولی ریاض الاسلام صاحب رئیس کاندھلہ سے منسوب ہیں اور کاندھلہ ہی میں مقیم ہیں۔

---

[1] راقم کی والدہ ۔ [2] اہلیہ قاضی محمد مکرم صاحب مائل تھانوی

مولانا محمد عمر مرحوم اور محمد صدیق مرحوم دونوں کی قبریں ریلوے اسٹیشن تھانہ بھون کے راستہ میں ایک چبوترہ پر واقع ہیں، نزدیک ہی ایک تاریخی کنواں ہے جو باتیں والے کے کنوئیں کے نام سے شہرت پذیر ہے، اس سے کسی قدر ہٹ کر عید گاہ ہے جو ہنوز اچھی حالت میں ہے۔

تلامذہ حضرت مولانا کے تلامذہ کی تعداد کثیر ہے لیکن محض تین حضرات کے اسماء گرامی معلوم ہوئے:۔

۱۔ قاضی شیخ محمد محدث مچھلی شہری جو ریاست بھوپال میں عہدۂ قضا پر فائز رہے۔

۲۔ نواب محمد علی خاں والی ٹونک جو ۱۸۶۴ء میں مسند نشین ہوئے اور ۱۸۶۸ء میں معزول کر کے بنارس بھیجدئے گئے۔

۳۔ دیوان شمس الدین نائب وزیر ٹونک[1]

مریدین و خلفاء حضرت مولانا شیخ محمد کے مریدین کی تعداد بہت تھی، لیکن ان میں سے چار بہت اہم ہیں:۔

۱۔ قاضی محمد اسمٰعیلؒ منگلوری (ف ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ) مولانا کے اجل خلیفہ تھے۔ صاحب باطن بزرگ اور قاضی عبد الغنی منگلوریؒ کے والد تھے قاضی عبد الغنی کا نام اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کے مرشد کی حیثیت سے اس قدر مشہور ہے کہ مزید تعارف کا محتاج نہیں۔ خود قاضی اسمٰعیل صاحب

---

[1] تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء۔

نے اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر بے انتہا شہرت پائی، انھوں نے سن ۱۳۱۲ھ میں ایک رسالہ "نور محمدی" بطور سوال و جواب حضرت ابو طالب محمد بن علی عطیۃ الیمنی المکی کی کتاب سے مسائل کا استخراج کر کے لکھا۔

۲۔ مولانا شیخ محمد تھانوی، قصبہ تھانہ بھون کی ان چند ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہیں، جن کی نسبت سے اس قصبہ کو دائمی شہرت نصیب ہوئی، علوم ظاہری و باطنی دونوں سے بہرہ وافی رکھتے تھے، صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ مولانا محمد عمر خلف الرشید حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی نے بعض کتابیں انہی سے پڑھی تھیں، انھوں نے اپنے پیر طریقت حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی کی مرتبہ شرح حزب البحر کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

۳۔ حکیم محمد عمر تھانوی بھی بزرگ اور ذی علم شخص تھے، انھوں نے حضرت مولانا شیخ محمد کے حالات زندگی بہ نثر "حالات محمدی" کے نام سے مرتب کئے تھے لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے، دوسرا اہم کام جو حکیم صاحب نے کیا تھا وہ حضرت مولانا شیخ محمد کی تصنیف مثنوی معنوی دفتر ہفتم کی ترتیب و اشاعت کا کام تھا، جس کو انھوں نے سن ۱۳۰۰ھ میں محبوب المطابع میرٹھ میں طبع کرا کر شائع کیا۔

۴۔ حاجی محمد صادق تھانوی جن کا ایک واقعہ قاضی ظفر احمد صاحب کے حوالے سے کہیں اور درج کیا جا چکا ہے، حضرت مولانا کے ان مریدین میں سے تھے جن میں پیر سے والہانہ شیفتگی ہوتی ہے، گو علوم ظاہری میں ان کو کوئی مرتبہ حاصل نہیں تھا لیکن علم باطنی میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔

تصنیفات حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گزرا، پھر آپ کی قوت تحریر بھی بے پناہ تھی، دنوں اور ہفتوں میں نہایت دقیق موضوعات پر کتابیں تیار کر دیتے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی تصانیف کی تعداد بہت تھی اس قیاس کو مولانا فتح محمد تھانوی کے اس فقرے سے مزید تقویت حاصل ہوتی ہے "حضرت کی تصانیف سے ہر قسم کی کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں بہت ہیں[1]" بعض کتابوں کے محض حوالے ملتے ہیں، مگر وہ کتابیں مفقود ہیں، بعض کتابیں ایسی ہیں جو حضرت مولاناؒ نے تصنیف فرمائیں، لیکن زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں۔ انہی کتابوں میں سے ایک رسالہ "تنقیہ الاعتقاد و تصفیہ الفواد من الکفر و الارتداد" ہے، جس کا حوالہ حضرت میانجی نور محمدؒ نے اپنے مکتوب گرامی میں دیا ہے،

متعدد کتابوں کے نام نزہت الخواطر میں درج ہیں، مگر ان میں سے محض چند نظر آتی ہیں۔ باقی مفقود و معدوم ہو چکی ہیں۔ مثلاً :۔

(۱) دلائل الاذکار فی اثبات الجہر بالاسرار (۲) القسطاس فی اثر ابن عباس۔ (۳) المکاتبت المحمدیہ فی اثبات الذکر والجہر (۴) المناظرۃ المحمدیہ، وہ کتابیں ہیں جن کے اب محض نام باقی رہ گئے ہیں۔

---

[1] حکیم محمد عمر حیدر تھانوی نے حضرت مولانا کی تصانیف کی مجموعی تعداد ۳۲ بتائی ہے جن میں سے نصف سے کم زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔

اس وقت حضرت مولانا کی محض سات تصنیفات مطبوعہ یا مخطوطہ کی شکل میں ہمیں دستیاب ہو سکی ہیں۔

(۱) حاشیہ پرسنن نسائی (۲) مثنوی معنوی دفتر ہفتم (۳) شرح حزب البحر (۴) ارشاد محمدی (۵) انوار محمدی (۶) بیاض محمدی (۷) رسالہ الہامات الموجود الودود فی تحقیق وحدت الوجود و الشہود۔

حضرت مولانا کی تصنیفات عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں موجود ہیں۔ اکثر کتابیں نثر میں ہیں، لیکن بعض نظم میں بھی تحریر فرمائی تھیں جن میں سے مثنوی معنوی دفتر ہفتم اس وقت موجود ہے، کتابوں کے موضوعات عموماً شرعی مسائل احادیث و تفسیر اور مسائل تصوف ہیں چونکہ بحثیں عموماً عالمانہ ہیں اس لئے عبارت میں بھی جا بجا عربی کے ثقیل الفاظ اور دقیق مصطلحات استعمال ہوئی ہیں۔ نظم نسبتاً صاف اور رواں ہے، اردو عبارت پرانے انداز کی ہے اور موجودہ محاورہ کے مطابق نہیں، فارسی اور عربی الفاظ کا غلبہ ہے اکثر مواقع پر حضرت مولاناؒ خود بھی اس بات کا احساس کر کے کہ بعض مشکل الفاظ استعمال ہو گئے ہیں۔ آسان لفظوں میں اس کی تشریح کرتے جاتے ہیں مثلاً ارشاد محمدی کی تمہید میں فرماتے ہیں:۔

.... ان کی اتباع سنت ظاہری اور باطنی کا یعنی سیرت اور سریرت کا شوق دل میں لگا یا۔ تا تکمیل ظاہری یعنی اصلاح اعمال اور تکمیل باطنی یعنی تہذیب اخلاق بکمال شوق و اطمینان .... حاصل ہو .... ہم نمک حرام نہ ہوں اپنے

منعم حقیقی اور مجازی کے یعنی خدا اور رسول کے بلکہ نمک حلال

ہوں یعنی موحد اور متبع سنت .....؟

یہی طرز بعض اوقات فارسی عبارتوں میں بھی جھلکنے لگتا ہے لیکن

اس کے نمونے بہت کم ہیں۔

حضرت مولانا کی جو چھ سات تصانیف دست برد زمانہ سے محفوظ

رہ گئی ہیں وہ بھی فی زمانہ نا کیاب ہیں۔ اس لئے ان پر انفرادی طور سے کچھ لکھنا

بے محل نہ ہو گا۔

۱۔ حاشیہ بر سنن نسائی، عربی میں ہے اور اس کی وجہ سے حضرت مولانا

طبقۂ علماء میں متعارف ہیں۔ ۱۲۹۵ھ میں جب آپ کو علالت سے کسی قدر افاقہ ہوا تو

آپ نے نسائی پر حاشیہ لکھنا شروع کیا، جب آپ اس کی تحریر میں مشغول

تھے تو آپ کا معمول یہ رہتا تھا کہ اشراق کی نماز پڑھنے کے بعد لکھنے بیٹھ جاتے

دو پہر تک لکھتے رہتے، نماز ظہر کے بعد پھر اس کام میں لگ جاتے، کتابیں بہت

کم دیکھتے صرف قوت حافظہ سے کام چلاتے تھے۔ غرض بہت جلد اس کام کو

مکمل کیا۔

سنن نسائی پر حاشیہ دو بار چھپا، دوسری مرتبہ ۱۳۱۹ھ میں طبع ہوا۔

اس میں کہیں کہیں اسماء الرجال کے اور کہیں کہیں حدیث کی شرح کے سلسلہ میں

فوائد درج ہیں۔

۲۔ مثنوی معنوی دفتر ہفتم[1]۔ اس مثنوی کے پانچ مکمل دفتر اور چھٹے دفتر کا

---

[1] مثنوی معنوی دفتر ہفتم کے متعلق مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی رقمطراز ہیں ۴۵

کچھ حصہ حضرت مولانا جلال الدین رومی نے لکھا تھا وہ چھٹے دفتر کو اتمام کو نہ پہنچا سکے تھے کہ پیام اجل آ گیا۔ ان کی رحلت کے وقت ان کے فرزند نے باحسرت و یاس کہا:

"ابا جان! آپ کا یہ کام نامکمل رہا جا رہا ہے"

حضرت مولانا رومؒ نے فرمایا:

"اس کی تکمیل وہ کرے گا جس کا یہ حصہ ہے۔ زبانم ماند و قلیم کاست"

عارف رومیؒ کی یہ پیشین گوئی کئی سو سال بعد پوری ہوئی۔ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کو خواب میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دفتر کو مکمل کرنے کا حکم فرمایا، چنانچہ حضرت مفتی الٰہی بخش نے اس کا تکملہ کیا اور فوت ہو گئے۔

حضرت مولانا شیخ محمدؒ نے اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

یا الٰہی بخش الٰہی بخش را	از جلالش بود ذکر در ورا
دفتر سادس مکمل کرد و رفت	عقدۂ کان بود ہم حل کرد و رفت

---

۱۲۵ یہ مثنوی اعلیٰ اور معیاری فارسی میں ہے، درحقیقت یہ مثنوی آپ کے ذوق شعری کی آئینہ دار اور آپ کی فارسی انشاء کا شاہکار ہے، سوز و گداز، سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایک بلند پایہ تصنیف ہے"

اس اعتراف کے بعد بھی حضرت مولاناؒ نے مثنوی کو نامکمل سمجھا اور اس کو کعبہ دل کے لئے طواف گردانتے ہوئے، ساتویں دفتر کی ضرورت محسوس کی ادھر حضرت جلال الدین رومیؒ اور شمس الدین تبریزیؒ کی طرف سے اشارہ ہوا۔ لہٰذا آپ نے کمر ہمت باندھی اور ساتواں دفتر مکمل کر دیا۔ ان تمام باتوں کی تفصیل اسی دفتر ہفتم میں اس طرح بیان فرماتے ہیں :۔

لیک چوں ہر دفتر است از مثنوی ؛ کعبۂ دل را طوافِ معنوی
تانہ طوفِ ہفتمیں گردد ادا او ؛ چوں شود ہر ہفت نظمِ مدعا
پس از ایمائے جلال پاک دیں ؛ وز ضیائے آں خورِ برجِ یقیں
بہر شوطِ سابعہ جاں حیست شد ؛ جستنیم در کار دنیا سست شد
خواہد از آں خاکِ انوارِ شمس ؛ گرد از ذرہ بغیر اکارِ شمس
ایں شرر ہا چوں بجانم ریختند ؛ شعلہ ہا در سینہ بر انگیختند
اندریں بودم کہ تیغ آں حسام ؛ مثل برق آمد بروں از بہر نیام
تیغ آں تیغِ دکانِ اصفہاں ؛ غوطہ ہا خوردہ بخونِ عاشقاں
مثلِ ماہِ نیم ماہ رخشاں ہلال ؛ ہمچو مہر نیمروز آتش خصال
آہنش از ہند و حداد از عجم ؛ بحر ہر جوہر عرض بر برق دم

مثنوی معنوی کا یہ دفتر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دو سال بعد ۱۸۵۹ء / ۱۲۷۶ھ میں بمقام رام پور منہاران مکمل ہوا۔ مادہ تاریخ تصنیف "شورشِ عشق" ہے۔

۱۲۷۶ھ

مولانا کی حیات میں اس دفتر کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی اور کئی سال تک یہ گرانقدر تصنیف مسودہ کی شکل میں رکھی رہی جب آپ کے مرید اور سوانح نگار حکیم محمد عمر چھتاولی کو حضور سرورِ کائنات صلعم نے خواب میں اس کی طباعت اور اشاعت کا حکم فرمایا تو انہوں نے نظر ثانی اور حواشی کے بعد ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء میں محبوب المطابع میرٹھ میں اس کو طبع کرا کر شائع کیا۔ خود حکیم صاحب نے اس کا مادہ تاریخ طباعت نکال کر قطعہ تاریخ لکھا اور مثنوی کے اخیر میں شامل کیا۔

قطعہ تاریخ طباعت

این مثنوی مقبول الٰہ ؛ چون طبع بمطبع عاطر شد
سال طبعش خوش گفت عمر ؛ بس مطبوع خواطر شد

۱۳۰۹ھ

مثنوی کا یہ دفتر محض ایک مرتبہ طبع ہوا۔ اس لئے نہ اس کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی اور نہ اب وہ عام طور پر ملتا ہے۔ کبھی کبھی بعض کتب خانوں میں یا اہل علم حضرات کے پاس دکھائی دے جاتا ہے، لہٰذا اس کے بعض حصوں کو یہاں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

خطاب بجناب عشق مآب و خواستگاری وصل باری

مرحبا اے دلبر دلبازِ ما ؛ آخ اے آئینۂ غمازِ ما
بستۂ صبر و قرار ما چو آب ؛ کردۂ ما را تو رسوا و خراب

هر بلا و شور کاں اندر جہاں است ژ بے گماں از دست تو اے جانِ ماست
کاش اے غمّاز آں اسکندرم ژ ہمعناں بر وی ترا سوئے عدم
ہاں مگر ایں ہم درست است و بجا ژ گر نبودے تو کجا بودیم ما
آنچہ ہستی ہستی آگاہیم ز تو ژ زانچہ جستی جستی آگاہیم ز تو
ہر چہ زابرت می چکد لیکن بجاں ژ کلک سرگشتہ کند چوں شرح آں
خوش بیا اکنوں کہ بینیم جذب تو ژ ہر چہ باشد دہ ز تلخ و عذب تو
تا بکے آخر جدائی اے وکیل ژ مژدہ بخش از وصالِ آں جمیل
در سرورش تا خوش و خورم زیم ژ لطف فرما لطف تا بے غم زیم
مثنویم اے محمّد نیست آں ژ اقتدا آرد بہ کس ز اہل زماں
بلکہ آبش چوں ز جامِ معنوی ست ژ ہم کلامم ہم کلام معنوی است
آنچہ آمد بر لب از ایرادِ عشق ژ ارمغاں آوردہ ام با صادِ عشق

در احوالِ سراپا اجلال حضرت رابعہ بصری بمعاملہ عشق و عاشقیٔ ذو الجلال

رابعہ را ایں مناجاتِ فخیم ژ بود در روز و شب پیشِ کریم
گر پرستش کردہ ام از ترسِ نار ژ نے تکلف سوز در دوزخ چو خار
ور برائے ضم ہست از بہرِ بہشت ژ کن حرامم آں گلستان و بہشت
ہاں پرستیدم ترا گر بہرِ تو ژ خواں پے دیدارِ خود در شہرِ تو
روزے آں مستغرقِ عشقِ خدا ژ با ہزاراں سوز و ساز و وجدہا
در کفے بگرفت کاسِ آبِ سرد ژ در کفِ آتش لعبد گرمی درد

وزره شوریدگی با نعره زن ؛ چیست از جانے ویلب با ندا ایں سخن
اے کجاہست آں جہنم واں جناں ؛ تازنم آتش دراں آب اندراں
کیں دو در خوف و رجائے خوشتن ؛ یا نداند از غم آں فرد من

— ❊ —

فی شرح الحدیث: تعبد الله کانک تراہ فان لم تکن تراہ انہ یراک

در عبادت جلوۂ معبود را ؛ جا بچشم جسم و جان دہ عابدا
در نہ بند و نقش ایں رنگ شہود ؛ شاہد خود شو کہ می بیند ودود
عاشقے کز مہر دیدن محو اوست ؛ حالتے دارد کہ طرز صحو اوست
سوئے عاشق بنگر و معشوق گر ؛ خوش پذیر د زاں دل و جاں آں اثر
انفعال و انتشاد در وے بود ؛ پس بحاشی محو ہمسر کے بود
زانکہ باشد رتبہ الفت و گر ؛ منصب ایں خوف و عبدیت دگر

۳۔ شرح حزب البحر۔ حزب البحر ایک دعا ہے جو ردِ بلا کے لئے پڑھی جاتی ہے، اس کے مصنف حضرت امام ابوالحسن شاذلی یمنیؒ ہیں جو فرقہ شاذلیہ کے سرخیل ہیں، ان کا مزار شہر مخا میں ہے۔ حضرت مولاناؒ نے ۱۲۷۰ھ میں جب وہ قصبہ رام پور میں بحالت روپوشی قیام پذیر تھے، دعائے حزب البحر کی شرح فارسی زبان میں لکھی اور اس کے فوائد و خواص بیان کئے۔

تمہید میں فرماتے ہیں کہ میں جب ۱۲۶۳ھ میں بعد ادائے فریضہ حج حرمین شریفین سے واپس آرہا تھا تو یمن میں رک کر امام شاذلیؒ کے مزار کی زیارت

سے مشرف ہوا۔"

اس کے بعد حضرت مولانا نے اس دعا کا شان نزول یہ بتایا ہے کہ "ایک مرتبہ امام شاذلیؒ مع اپنے مریدین حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے، ساحل سمندر پر محض ایک شکستہ کشتی ملی، حج کا زمانہ قریب تھا اس لئے مجبوراً اسی پر سوار ہو لئے، سمندر کے بیچ میں پہنچے تو کشتی ایک طوفان عظیم میں گھر گئی اور اس کے غرق ہونے کا اندیشہ ہوا۔ امام شاذلیؒ نے اس وقت یہ دعا پڑھی اور سمندر کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

"یَا بحر اسکن فانّ علیک بحر العلوم"

خدا کی قدرت طوفان فوراً ختم ہو گیا، اس واقعہ سے تعلق کی بنا پر اس دعا کا نام حزب البحر پڑ گیا۔ اب یہ دعا صرف طوفان ہی کے موقعہ کے لئے مخصوص نہیں رہی بلکہ ہر مشکل کے وقت پڑھی جاسکتی ہے۔

حضرت مولانا شیخ محمد کی فارسی شرح کا حضرت مولانا فتح محمد تھانوی نے حاجی محمد صادق کے ایما سے عام فہم اور آسان اردو میں ترجمہ کیا، وہی ترجمہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

شرح حزب البحر کے خاتمہ پر حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی یہ عبارت مختصر ہونے کے باوجود اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس سے جنگ آزادی کے بعد کے چند واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

"جس وقت یہ فقیر شیخ محمد تھانوی، فاروقی، عمری، مجددی، نقشبندی، چشتی، صابری، سید احمدی، نوری تحریر تصنیف

اور تبیض اس سے شرح حزب البحر سے فارغ ہوا۔ ایک پہر دن چڑھا تھا اور تاریخ بائیسویں ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ بارہ سو ستر ہجری مقدسہ تھی۔ قصبہ رام پور منہاران ضلع سہارنپور اس حویلی میں جو محل کے نام سے مشہور ہے اور وہ مکان اصل میں شیخ سالار صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، اور جس وقت یہ فقیر اپنے وطن اور مولد اور مسکن سے جلا وطن ہو کر یہاں مقیم تھا ـــــ"

۴۔ ارشاد محمدی۔ اردو زبان میں تصوف کا ایک مختصر رسالہ ہے ۱۲۹۲ھ میں مطبع صدیقی بریلی میں طبع ہوا تھا، منشی غلام بسم اللہ بسمل، منشی محمد احسان اللہ محبر اور مولوی قاسم علی خواہاں نے قطعات تاریخ لکھے پہلے دو حضرات کے قطعے فارسی میں ہیں۔ خواہاں صاحب نے اردو میں طبع آزمائی کی ہے اور اس بات کا التزام کیا ہے کہ قطعہ سے رسالہ کا موضوع بھی معلوم ہو جائے فرماتے ہیں: ـــــ

چھپ کے تیار فضل حق سے ہوا ؛ طرز اذکار اولیائے کرام
سال اس کا ہے باسر بہجت ؛ نادر اعلیٰ اچھی کتاب تمام

اس رسالہ کا موضوع تصوف کے مختلف سلسلوں کے اشغال و اذکار کے طریقوں کو بتاتا ہے، مولانا نے یہ رسالہ بعض حضرات کی فرمائش سے ۱۲۷۰ھ میں لکھا تھا، چنانچہ خود تحریر فرماتے ہیں: ـــ

"حسب درخواست بعضے بھائیوں، اخلاص مشحون

مجھ عاجز اہل میرٹھ سے خصوص مولوی فدا علی صاحب میرٹھی اور منشی محراب علی صاحب الخیب شہری چند ارشادات طریقہ علیہ چشتیہ، صابریہ، قدوسیہ اور طریقہ بہیہ، نقشبندیہ، مجددیہ خصوص طریقہ ولی اللہیہ عزیزیہ سیدیہ احمدیہ نوریہ امدادیہ کہ ترطریقہ مقتدریہ کہ راضی ہو اللہ ان سے اور ان لوگوں سے جو اپنے اعلیٰ پیر طریقت بیعت و ارادت و صحبت ظاہری و معنوی سے اعنی نور الاسلام حضرت مولانا شیخ المشائخ میانجیو نور محمد صاحب جھنجھانوی قدس سرہ اور پیر طریقت و بیعت و ارادت و صحبت مولانا و اولانا حضرت قبلہ الہدایت و الارشاد کعبہ الصوات والراد امام ہمام امام المسلمین اسعد اوحد اسمہٗ احمد حضرت سید صاحب بریلوی قدس سرہٗ سے پہنچے اور بر اس روشن کے جو معمول یہ مجھ عاجز کے ہیں اردو ریختہ زبان میں ہنگام قیام میرٹھ اپنی ۱۲۷۷ھ بہ نظر نفع عام قید تحریر میں آئے اور نام اس رسالہ کا بہ نظر فی الجملہ اسم بامسمیٰ ارشاد محمدی رکھا۔"

اس تمہید کے بعد اصل مضمون پیش کیا گیا ہے، جس کو حضرت مولانا نے اپنی دانست میں "بہ نظر فیض عام" تحریر کیا تھا، لیکن آج کل کے ماحول میں خاص لوگ ہی اس سے فیضیاب ہو سکتے ہیں، ایک مختصر سے اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے:۔

ان لطائف میں ایک حرکت نبضیہ ہے، طالب کو چاہیے کہ اس اس کو خوب دھیان کرکے بغور تمام اسم ذات مبارک سمجھتا ہے یہاں تک کہ ایسا جم جاوے کہ جو خود مٹانا چاہے تو نہ مٹا سکے یہ اعلیٰ رتبہ مشق کا ہے، ادنیٰ رتبہ بیداری ان لطائف کا یہ ہے کہ عین مشغولی کاروبار دنیاوی وغیرہ میں طالب کو لطائف اپنی طرف متوجہ کرلیں، یہ انعام الٰہی عجیب ہے اور اس سلسلہ والوں پہ طالب کو چاہیے کہ شاکر ہو۔

۵۔ انوار محمدی۔ یہ رسالہ مولانا کی آخری عمر کی تصنیفات میں سے ہے خود مولانا نے اس کے سنہ تصنیف کا کہیں ذکر نہیں کیا، لیکن آخر میں جو مادہ تاریخ درج ہے اس سے اس رسالہ کا سنہ تصنیف ۱۲۹۱ھ نکلتا ہے۔ یہ مادہ مولوی عبدالحکیم صاحب متخلص بہ حکیم نے نظم کرکے کتاب کے آخر میں شامل کیا ہے

اس قطعہ کے چار شعر ہیں۔ جن کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

انوار محمدی است برہان ؎ کاندر دل وجان کند تصرف
در فکر شماء مطلع سال ؎ رو داد چو اند کے توقف
فرمود حکیم فیض عرفان ؎ بے ساختہ نزرہ تکلف
تاریخ دگر کہ بود مقصود ؎ دریاب ز نسخہ تصوف
۱۲۹۱

انوار محمدی فارسی زبان میں لکھی گئی تھی، لیکن آخر میں کچھ درودوں کا ترجمہ اردو میں کردیا گیا ہے۔ کل رسالہ ۱۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ محمد حیات مطبع ضیائی

میرٹھ نے اس عبارت کے ساتھ طبع کیا :-

احقر باستجازت جناب مستطاب مصنف صاحب مدظلہم این کتاب طبع نمودہ است ہے حسب قانون ۱۸۴۷ء اجاری مجاز طبع نیست۔

رسالہ کی عبارت مسجع اور دقیق ہے، شروع میں خود مصنف کبھی اپنی عادت کے بموجب اپنے جملوں کو قسکل سمجھ کر اعمی سے تشریح کرتے چلے گئے ہیں یہ رسالہ اگرچہ مجموعی طور پر شریعت اور طریقت کے بعض مسائل پر مشتمل ہے۔ لیکن موضوعات مختلف النوع ہیں۔ شروع میں سالک کے بعض تجربات اور اس کے قلب کی کیفیات سے متعلق سوالات اور ان کے نہایت تشفی بخش جوابات ہیں مثلاً :-

سوال — روزے کہ شغل دورہ نمودم تمام شب بمشاہدہ محظوظ ماندم و ازاں ہیچ انوار قدسیہ محسوس نمی گردد۔

جواب — افادہ مشاہدہ چوں لطیف و صافی می شود ادراک آن بر سالک دشوار تر می شود و گمان می برد کہ مرا ہیچ حاصل نیست و اگر مشاہدہ متکیفہ بکیفیتہ و الوان و شیون می باشد در ادراک می آید و میداند کہ مرا مشاہدہ حاصل است حالانکہ مشاہدہ ملون ادنیٰ و مشاہدہ بے لون اعلیٰ است کہ ذات الٰہی مستجمع جمیع کمالات و متنزہ و مبرا از جملہ کوائف و بیچون و چگوں است ہر چند بے کیفیت باشد مشاہدہ کامل است پس طالب را باید کہ خواہان مشاہدہ بے کیف باشد و آن را بالیقین و بالقطع مشاہدہ ذات پاک داند و ہیچ شک و شبہ را در آن راہ ندہد۔

ان سوالات اور جوابات کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد کچھ تعویذات ہیں۔ پھر صفحہ ۳۰ پر میاںجیو نور محمد صاحب کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

فقیر خاکپائے فقراء دین ...... بعد اخذ بیعت سلسلہ اجازۃ حاصل شد ونعمتہ خاندان اربعہ مع شعب متفرقہ وتبرکات مرحمت داشت کہ آن وقت دیگر یاران وعزیزان از خادمان آن عالی جناب ومتعالی جناب موجود بودند۔ اگر ذکر محامد ومناقب آن یاران و نادارن بر صفحہ بتلیفش بہ تفصیص نوشتہ آید نسخہ ہذا بطولانی انجامد لہذا باسہر بازدیگر رسالہ مستقلہ انشاء اللہ تعالٰی منحصر داشتہ شد۔

اس عبارت کے بعد چشتیہ، صابریہ، نقشبندیہ، قادریہ چشتیہ نظامیہ اور سہروردیہ کے مکمل شجرے لکھے گئے ہیں۔ پھر سید احمد صاحب شہیدؒ کا نسب نامہ دے کر کچھ خطوط نقل کئے ہیں۔

پہلا خط حاجی شاہ عبد الرحیم صاحب ولایتی کی جانب سے میاںجیو نور محمد صاحب کے نام ہے۔

دوسرا خط حضرت سید احمد صاحب شہید کی جانب سے لاہور کے مسلمانوں کے نام ہے جو حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید نے تحریر کیا تھا۔

پانچ خطوط حضرت میاںجیو نور محمد صاحب کی جانب سے حافظ محمد ضامن شہیدؒ، حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کے نام ہیں، ان خطوط میں سے ایک خط کا ترجمہ گذشتہ صفحات میں درج کر دیا گیا ہے۔

ان مکتوبات کے بعد حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ کی

بعض مسائل پر تحقیقات درج ہیں، جو سوال وجواب کی شکل میں درج ہیں پھر طریقہ مجددیہ کا مفصل بیان ہے۔

آخر میں ادعیہ ماثورہ اور ان کا فارسی ترجمہ ہے، خاتمۃ الکتاب پر ایک صد درود شریف اور ان کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے، اس حصہ کو "آیۃ صلوٰۃ وصلوٰۃ محمدی" سے نامزد کیا ہے۔

غرض کہ یہ چھوٹا سا رسالہ شریعت اور طریقت کے متعدد مسائل پر مشتمل اور نہایت جامع ہے۔

۷۔ بیاض محمدی۔ یہ رسالہ عملیات پر مشتمل ہے، مولانا نے فارسی زبان میں تحریر فرمایا تھا، مگر محمد احمد اللہ صاحب مظفر نگری نے ۱۳۵۷ھ میں اردو ترجمہ کر کے ایک خاص ترتیب سے رسالہ عطاء المنان کے نام سے شائع کرایا۔ اس کے متعلق مترجم نے تمہید میں جو نوٹ دیا ہے ہم اس کو نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں:۔

> عملیات اور تعویذات میں اگرچہ آپ کو زیادہ انہماک و توغل نہیں ہوا مگر چونکہ طبیعت کے ذکی و ذہین واقع ہوئے تھے محض رفاہ خلق اللہ کے لئے تھوڑی توجہ سے اس فن میں بھی کمال حاصل کر لیا، جہاں سے عملیات ہاتھ آئے تجربہ کرنے کے بعد اپنی بیاض میں درج فرمالیا۔ باوصف اس عدم توجہی کے جنات اور آسیب آپ کے نام سے کانپتے تھے!!

نقل:۔ فقیر مترجم بیاض محمدی کی ایک بنگالی طالب علم سے جو دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے ۱۳۵۵ھ میں ملاقات ہوئی، بر سبیل تذکرہ حضرت مولانا کا ذکر آگیا، وہ صاحب خود عملیات کا شوق رکھتے تھے مگر مولانا سے واقف نہ تھے

آپ کا اسمِ گرامی سن کر تعجب و حیرت سے کہنے لگے:۔

"کیا یہی وہ مولانا ہیں؟ جن کا نام ہمارے اطراف میں اب تک مشہور ہے کہ جس وقت کوئی خبیث جن یا آسیب کسی کو ستائے اور اس سے لوگ عاجز ہوجائیں تو شیخ محمد تھانوی ہتیلی پر لکھ کر آسیب زدہ کو دینے سے جن و آسیب فوراً فرار ہوجاتا ہے"

رسالہ بیاض محمدی جو مولانا کا خزانہ عملیات ہے، مولانا کی وفات کے بعد آپ کے خلیفۂ مجاز حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری قدس سرہٗ کے ارشاد سے حضرت قاضی صاحب کے پیر بھائی حضرت مولانا مولوی سید رحم الٰہی صاحب منگلوری رحمۃ اللہ علیہ نے مکمل طبع کرا کر شائع کرایا مگر چند ہی روز بعد حضرت قاضی صاحب کے نام خط پر خط آنے لگے کہ آپ نے غضب کردیا لوگ حب تسخیر کے اعمال ناجائز طور پر عمل میں لا کر فتنے میں پڑ گئے۔ حضرت قاضی صاحب نے یہ معلوم کر کے جس قدر نسخے موجود تھے سب جلوا کر دریا برد کرادئے اور بقیہ بھی دوگنی چوگنی قیمت دے کر چھپائے اور تلف کردئے اس کی تلافی اس طرح کی گئی کہ بیاض محمدی میں سے وہ عملیات تسخیر و حب جو تیر بہدف اور سہل الحصول تھے نکال ڈالے اور مولانا عبدالرحیم صاحب نے دوبارہ ترتیب دے کر مطبع مجتبائی دہلی کو دیدیا جنہوں نے بجنسہٖ اس کو فارسی و عربی میں طبع کرادیا، اور آج تک وہ انتخاب شدہ رسالہ مطبع مجتبائی سے دو آنے قیمت پر ملتا ہے۔

جس زمانہ میں یہ رسالہ طبع ہوا تھا فارسی زبان کی قدر تھی، مگر عرصہ بتیس سال سے فارسی قریب قریب ہندوستان سے مفقود ہو گئی ہے، عرصہ سے اہل علم و شائقین عملیات متمنی تھے کہ یہ مفید عام رسالہ اردو میں شائع ہو جائے، فقیر کو اسی زمانہ سے خیال تھا کہ کسی طرح یہ نایاب اور مفید عام رسالہ اردو میں شائع ہو جائے مگر مکروہات دنیوی سے مجبور تھا۔ آخر ۱۳۵۰ھ میں باوجود ہجوم افکار کمر ہمت باندھ کر یہ رسالہ اردو میں مرتب کر لیا اور مخزن عملیات محمدی اس کا
۱۳۵۰ھ
نام قرار پایا۔[1]

۷۔ مناظرہ محمدی[2]: یہ رسالہ حضرت مولانا کی قوت تصنیف و تالیف کا ایک نادر نمونہ ہے۔ جب آپ حرمین شریفین سے لوٹتے وقت بمبئی پہنچے تو پتہ چلا کہ مولانا فضل حق خیر آبادی نے امام فخر الدین رازی کے بعض اقوال کی تردید میں ایک کتاب لکھ کر شائع کی ہے، آپ نے اس کو پڑھا تو بہت رنج ہوا، فوراً اس کا جواب لکھنے پر کمر بستہ ہو گئے۔ ایک دن مراقبہ میں آپ کی ملاقات امام فخر الدین رازی سے ہوئی۔ اس سے آپ پر انشراح ہوا اور راستہ ہی میں قلم برداشتہ مولانا فضل حق کی کتاب کے جواب میں ایک رسالہ لکھ ڈالا۔ دہلی پہنچے تو مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور کی خدمت میں پیش کیا، وہ تمہید اور مضمون کو پڑھ کر دنگ رہ گئے آپ سے گلے ملے اور اس رسالہ پر تقریظ لکھ کر اپنی مہر ثبت کر دی۔

۱؎ رسالہ عطاء المنان　　۲؎ تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء۔

حضرت مولانا کے اس رسالہ کا موضوع فلسفہ ہے، اس کے متعلق حضرت مولانا قاسمؒ بانی دارالعلوم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا۔

یہ رسالہ اگر کتب درسیہ علم حکمت میں داخل ہو تو قاضی مبارک کے بعد صدرہ کے تحت ذہین آدمی ہی اس کو سمجھ سکتا ہے![1]

یہ رسالہ طبع ہوا تھا مگر اب نایاب ہے۔

۸۔ قسطاس فی موازنہ اثر ابن عباس: یہ کتاب مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی کتاب دافع الوسواس کے جواب میں تحریر کی تھی۔

۹۔ رسالہ الہامات الموجود الودود فی تحقیق وحدت الوجود والشہود۔[2] یہ ایک غیر مطبوعہ فارسی رسالہ ہے، جو حضرت مولانا شیخ محمدؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا آپ کی قلمی بیاض میں موجود ہے۔ حضرت مولاناؒ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو ۷ ذی قعدہ ۱۲۶۳ھ کو مکہ معظمہ میں خاص حرم محترم کے اندر آپ پر وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے پیچیدہ مسئلہ کے بارے میں کچھ انکشافات ہوئے جن کو آپ نے ایک ہفتہ میں ترتیب دے کر قلم بند کیا۔

---

[1] "تذکرہ" اپریل ۱۹۶۲ء

[2] یہ رسالہ حضرت مولانا کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے اس لئے اس کا ذکر سب سے پہلے ہونا چاہئے تھا، لیکن چونکہ اس وقت اصل مقصد یہی رسالہ پیش کرنا اور اسی کے موضوع پر تفصیلی بحث کرنی ہے اس لئے اس کے ذکر کو مصلحتاً موخر کر دیا گیا۔

یہ رسالہ اگرچہ الہامات پر مبنی ہے، لیکن بحث خالص فلسفیانہ اور منطقیانہ ہے۔ حضرت مولاناؒ نے فلسفہ کی اصطلاحات و اصول کو کام میں لا کر ان پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے اور آخر میں وحدۃ الوجود کی جانب اپنے میلان طبیعت کا اظہار کر کے حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب سے اس کی توثیق و تصدیق کرا دی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

قبل از تسویدِ این سودا و سود ؛ مجملاً دیدیم در واقعہ کہ بود
در حرم با شیخ یعقوب ام بجواب ؛ گفتم از تقریر من دادہ جواب
یعنی تقریرِ آئینہ کا دل گذشت ؛ گفت کایں وحدۃ وجود آں خود گذشت
حق و انصاف است کہ تو گفتی ؛ گوہر ناسفتہ را تو سفتی
لیک در ظاہر نمی گویم فاش ؛ تا بزخم عامیاں نبود خراش

پس بہ سلطان ذکر او مشغول شد
بر دلم فیضان او مبذول شد

اس طرح ایک فتنہ کے ڈر سے دونوں نظریوں کے درمیان مفاہمت کرا دی ہے، یہی وہ مسلک ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد سے اہل التصوف نے اختیار کیا اور اسی مسلک نے اس وسیع خلیج کو ایک حد تک پاٹ دیا جو فرقہ علیہ اور فرقہ ورایہ کے نظریوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔

حضرت مولاناؒ کے اصل رسالہ کو پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مفہوم اور تاریخی پس منظر بتا کر ایک مختصر سا خاکہ ان دونوں نظریوں کا پیش کر دیں۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی تشریح اور ان کا تاریخی پس منظر

صوفیہ میں یہ دو اصطلاحیں نہایت طویل عرصہ سے رائج ہیں، لیکن چونکہ ان کا تعلق ایک وجدانی کیفیت سے ہے اس لئے آج تک ان کی واضح طور پر تعریف و تشریح نہیں کی جاسکی اور نامکمل اور غیر معین تشریحات کی وجہ سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جنہوں نے بحث و تحقیق کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کر دیا۔

اس وقت تک ان دونوں اصطلاحوں کی جو جو توضیحات پیش کی گئی ہیں، وہ سب سامنے رکھ کر مختصر لفظوں میں ان کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے

نظریہ وحدۃ الوجود کی رو سے وجود صرف ایک ہے اور وہ ذات خداوندی ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء اس کی صفات[1] کے مختلف مظاہر اور شیون ہیں، ہمہ وقت وہ ذات اپنی شانوں کا طرح طرح سے اظہار کرتی رہتی ہے اسی کی طرف قرآن مجید کے یہ الفاظ "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَانٍ" اشارہ کرتے ہیں۔ اس نظریہ کے بموجب ذات خداوندی اور کائنات ایک دوسرے کے عین ہیں اور ان میں دوئی کا کوئی شائبہ نہیں۔ ذات خداوندی ایک بحر ناپیدا کنار ہے اور اشیائے کائنات اس کی سطح پر لہریں، بلبلے اور کفیں ہیں جو برابر ابھرتے

---

[1] صفات کو ذات سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا، اس لئے صفات کے مظاہر و شیون بالواسطہ ذات کے مظاہر و شیون ہیں۔

اور مٹتے رہتے ہیں، جس طرح ان چیزوں کی دریا سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں اسی طرح اشیاء کائنات بھی ذات خداوندی سے علیحدہ ہو کر غیر حقیقی اور معدوم ہیں، جیسے دریا اپنی ذات میں حقیقی اور قائم بالذات ہے اور لہریں بلبلے وغیرہ محض عوارض ہیں، اسی طرح ذات خداوندی حقیقی اور قائم بالذات ہے اور اشیاء کائنات محض عارضی ہیں. قرآن مجید نے ھو الاول والاخر والظاھر والباطن وھو بکل شئ محیط کے پاک الفاظ سے اس سر مکتوم کو آشکارا کر دیا ہے۔

وحدۃ الشہود کا نظریہ دراصل وحدۃ الوجود کے نظریہ کے ردعمل کے طور پر پیش کیا گیا تھا، اس کے بموجب ذات خداوندی اور اشیاء کائنات ایک دوسرے کے عین نہیں بلکہ غیر ہیں، خدا کی ذات ہماری عقل و فہم کی رسائی سے باہر ہے۔ کائنات خدا کی ذات یا صفات کے مظاہر نہیں بلکہ موجود بالذات ہیں. خدا نے عدم محض سے ان کو پیدا کیا ہے۔ اس لئے خدا اور جملہ اشیاء میں خالق و مخلوق کا تعلق ہے. وحدۃ الشہود کے نظریہ کے بموجب اگر سالک کو حالت جذب میں خدا اور کائنات کے درمیان عینیت کا تعلق نظر آتا ہے تو وہ حقیقی نہیں بلکہ نفسیاتی ہوتا ہے جب سالک راہ از دیاد محبت سے سرشار ہو کر ماسوا سے نظریں ہٹا لیتا ہے اور صرف خدا کے تصور کو ہی اپنے ذہن میں قائم رکھتا ہے تو اس کو ذات خداوندی کے سامنے اپنی ذات اور کل کائنات معدوم نظر آنے لگتی ہے اور وہ اس سرشاری و سرمستی میں کہہ اٹھتا ہے کہ "خدا کی ذات کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود نہیں اور اگر کوئی چیز نظر آتی ہے تو وہ وہی ہے اسی کیفیت میں کبھی وہ "انا الحق" پکار اٹھتا ہے اور کبھی "سبحانک شانی،، کہنے لگتا ہے. درحقیقت یہ کیفیت اس کے

اپنے جذبہ اور شہود کی کارفرمائی ہے اور واقعیت یا اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ گویا سالک کو وقتی طور پر اس وحدۃ کا مشاہدہ ہوتا ہے، اسی لئے اس کو وحدۃ الشہود یا توحید شہودی کہنا مناسب ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی صدیوں میں ان دونوں اصطلاحوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس وقت صرف وحدانیت پر زور دیا جاتا تھا معبود ہونے میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک گرداننا سب سے بڑا بلکہ ناقابل معافی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی پر ایمان کی بنیاد تھی۔ کلمہ طیبہ کا پہلا جز اسی عقیدہ کو مستحکم کرنے کے لئے پڑھا جاتا تھا۔ قرن اول کے صوفیا اور اولیا بھی اسی عقیدہ پر کاربند رہے اور انہوں نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی اصطلاحیں استعمال کرکے کبھی ذات خداوندی اور کائنات کے تعلق کی تشریح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اتباع شریعت ان کا مقصد اور تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ان کا منتہائے نظر تھا۔

دو تین صدیاں گذرنے کے بعد حالات بدلے، مختلف اثرات نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو میں تبدیلی پیدا کی التصوف میں بھی طرح طرح سے رنگ آمیزی ہونے لگی۔ باطنی اصلاح کے لئے لفظ "احسان" کو ہٹاکر "تصوف" نے اس کی جگہ لی، غالباً حضرت ذوالنون مصری نے بعض بیرونی اثرات کے تحت نہایت دھیمے سروں میں وحدت الوجود کا نغمہ الاپا۔ آہستہ آہستہ یہ لے بڑھتی گئی اور آخرکار حضرت محی الدین ابن عربیؒ نے نہایت بلند آہنگی سے اس کو پیش کیا۔ ان کی آواز میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ اس کی صدائے بازگشت ہر طرف سنائی دینے لگی۔

نظریۂ وحدۃ الوجود ہی اصل واساس دین سمجھا جانے لگا۔ آیات قرآنی کی تشریح وتفسیر اسی نہج پہ ہونے لگی گویا پورا قرآن اسی نظریہ کی اشاعت کی غرض سے نازل ہوا تھا۔ بعض احادیث بھی ایسی فراہم کرلی گئیں جن سے اس نظریہ کی تائید ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ غرض پورا تفکر اسلامی اسی رنگ میں رنگا گیا انتہا تو یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کے جزء اول لا الٰہ الا اللّٰہ کا مفہوم لا معبود الا اللّٰہ کی جگہ لا مقصود الا اللّٰہ اور لا موجود الا اللّٰہ لیا جانے لگا۔

حضرت محی الدین ابن عربیؒ اس نظریہ کے انتھک مفسر تھے۔ انہوں نے نہ معلوم کیا سمجھا اور کیا کہا، لیکن بعض اہل اللہ نے ان کے زمانہ میں اور بعض نے ان کے بعد ان کی ہمنوائی شروع کردی۔ ان مقتدر ہستیوں میں مولانا جلال الدین رومی، صدرالدین قونوی، فخرالدین عراقی، احدالدین کرمانی، مولانا جامی اور محب اللہ الٰہ آبادی کے اسماء بہت اہم ہیں۔ ان واقفان راز نے جب نہاں خانۂ دل کے اس سر مکتوم کو متواتر اور مختلف طریقوں سے دوہرایا تو دوسرے بھی ان اشاروں کو لے اڑے اور چونکہ ان کی فہم اصلیت وحقیقت تک نہ پہنچ سکی اس لئے اس کی ایسی تشریحات وتاویلات پیش کیں جنہوں نے اس نظریہ کو بڑی حد تک مسخ کردیا اور اس میں زندقہ کی پوری شان پیدا ہوگئی۔

حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے نظریہ وحدۃ الوجود اس قدر بدل گیا کہ اس میں اور نظریہ حلول میں کچھ فرق باقی نہ رہا، یہ دیکھ کر شیخ مجدد نے اس کی اصلاح کی جانب توجہ کی۔

ان کے کشف نے ان کو یہ بھی یقین دلادیا کہ وحدت الوجود کا نظریہ در حقیقت سلوک کی ایک درمیانی کیفیت ہے۔ سالک راہ جب منزل فنا میں داخل ہوتا ہے تو ایک طرف وہ اپنے بشری خواص کو فراموش کر دیتا ہے اور دوسری جانب اشیاء کائنات سے اپنی توجہ ہٹا لیتا ہے اس وقت اس کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہر سمت اور ہر جہت میں خدا کی ذات وصفات جاری وساری ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی شئے موجود ہی نہیں، اس وقت کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسی سورج کی تیز روشنی پھیلنے کے بعد چراغوں اور چاند ستاروں کی ہوتی ہے۔ خارج میں تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں لیکن ضیائے مہر کے سامنے معدوم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بوقت شہود تجلیات الٰہی سب چیزوں کو نظروں سے اوجھل کر دیتی ہیں لیکن حقیقتاً نہ وہ معدوم ہوتی ہیں اور نہ ان کو معدوم سمجھنا چاہئیے۔

حضرت شیخ مجددؒ نے اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر فرمایا کہ مجھ پر بھی یہ کیفیت گذر چکی ہے، جب میں مقام علییت پہ پہنچا تو سوائے ذات خداوندی کے اور کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا میں اس وقت توحید وجودی کو حق سمجھنے والوں میں تھا کچھ عرصہ بعد جب میں اس مقام سے نکل کر راہ سلوک میں آگے کی طرف بڑھا تو مقام ظلیت پہ فائز ہوا، اس وقت مجھے اپنے پہلے تجربہ میں کچھ تبدیلی سی محسوس ہونے لگی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ خدا کی ذات اور کائنات ایک دوسرے کے عین نہیں ہیں بلکہ اصل اور ظل کا سا تعلق رکھتے ہیں، جس طرح ظل اصل سے جدا اور اصل کے مقابلہ میں غیر حقیقی ہوتا ہے، اسی طرح کائنات بھی ذات خداوندی سے جدا اور غیر حقیقی ہے، تاہم چونکہ ظل کا وجود کلیتاً اصل کا رہین منت ہوتا ہے

اس لئے وحدۃ الوجود کا ایک ہلکا سا تصور اس وقت بھی قائم رہتا ہے، اس مقام پر پہنچکر میں نے اس کمزور سے تعلق ہی کو غنیمت جانا اور خواہش کی کہ اس مقام سے نہ نکلوں، لیکن کچھ عرصہ بعد جب راہ سلوک میں آگے قدم رکھا تو محسوس ہونے لگا کہ یہ کیفیت بھی عارضی اور حقیقت سے بعید تھی، اب میں مقام عبدیت پر فائز ہو چکا تھا، اور مجھے واضح طور پر نظر آنے لگا تھا کہ خدا اور کائنات ایک دوسرے سے الگ وجود رکھتے ہیں۔ خدا خالق کائنات ہے اور اس نے جملہ اشیاء کو عدم محض سے پیدا کیا ہے، ذات خداوندی کا عرفان انسان کے عقل وفہم، ادراک و مشاہدہ اور وجدان سے ماورا ہے، انسان کسی طرح بھی اس کی ذات وصفات کو سمجھ اور پہچان نہیں سکتا وہ ذات اور اس کے ساتھ اس کی تمام صفات ہر حیثیت سے وراء الورا ہیں :

سبحانہٗ وراء الوراء ثم وراء الورا ثم وراء الوراء

حضرت مجدد الف ثانی نے جب اس امر کا قطعیت کے ساتھ فیصلہ کر دیا کہ ذات وصفات خداوندی کا عرفان انسان کے لئے ناممکن ہے تو اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی فرمادیا کہ تصوف کا مقصد عرفانِ ذات وصفات نہیں بلکہ تصفیہ قلب اور تزکیہ نفس ہے۔

غرض شیخ مجدد نے وحدۃ الوجود کے نظریہ کی تردید اس قدر وثوق و اتقان کے ساتھ کی اور اپنے استدلال کی بنیاد منطق وفلسفہ پر نہیں بلکہ کشف و شہود اور روحانی تجربات پر رکھی کہ کسی کو ان کی مخالفت کی ہمت نہ ہو سکی ان کے اس اجتہاد نے سب کو غور و فکر میں مبتلا کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ شیخ مجدد کے ہم خیال لوگوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو دن بدن قوت پکڑنے لگا۔

ایک صدی گزرنے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کا دور آیا، اس وقت ملک میں دونوں نظریوں کے ماننے والے موجود تھے، اس اختلاف کو دیکھ کر ایک حقیقت کے متلاشی نے حضرت شاہ صاحب سے رجوع کیا، انھوں نے جواب میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام "فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود" ہے، اس میں بدلائل قویہ یہ امر ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شیخ اکبر کا وحدۃ الوجود اور شیخ مجدد کا وحدۃ الشہود ایک ہی شئے کے دو نام ہیں۔ ان میں مطابقت ہے مخالفت نہیں۔ نیز شیخ مجدد کا ان کو ایک دوسرے سے الگ سمجھنا تسامح کی بناء پر تھا۔

اس بات کو حضرت شاہ صاحب نے طرح طرح سے سمجھایا ہے فرماتے ہیں۔

"وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود دو لفظ ہیں کہ دو جگہ بولے جاتے ہیں (۱) کبھی تو مستعمل ہوتے ہیں بحث میں سیر الی اللہ کے تو کہا جاتا ہے کہ اس سالک کا مقام وحدۃ الوجود ہے اور اس سالک کا مقام وحدۃ الشہود ہے اور معنی وحدۃ الوجود کے یہاں استغراق ہے، ایسی حقیقت جامعہ کی معرفت میں جو عالم کو فانی کرتی ہے اس حیثیت سے کہ وہ ساقط ہو جائیں اور وحدۃ الشہود کے معنی ہیں احکام جمع و تفرقہ کا جمع کرنا یعنی یہ سمجھنا کہ سب چیزیں واحد ہیں ایک وجہ سے اور متغائر ہیں دوسری وجہ سے۔ اور یہ مقام پہلے مقام سے اتم اور ارفع ہے۔

(۲) کبھی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود دونوں لفظ مستعمل ہوتے ہیں، حقائق اشیاء کی معرفت میں جیسے وہ ہیں۔ چنانچہ حادث اور قدیم کے ربط پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک قوم کے نزدیک عالم اعراض مجتمعہ ہیں حقیقت واحدہ میں۔ مثلاً موم

سے انسان، گھوڑے اور گدھے کی مورتیں بنالی جائیں، اب باوجودیکہ ان سب مورتوں میں موم کی طبیعت باقی رہتی ہے لیکن ان مورتوں کو موم نہیں کہا جائے گا بلکہ انسان کی مورت کو انسان، گھوڑے کی مورت کو گھوڑا اور گدھے کی مورت کو گدھا کہا جائے گا۔ غور کیا جائے تو وہ مورتیں حقیقت میں تمثالیں ہیں جن کا خود کوئی وجود نہیں بلکہ وہ موم کے سبب وجود رکھتی ہیں جو فرقہ یا قوم اس طرح ماہیت اشیاء پر غور کرتی ہے اس کا نظریہ وحدۃ الوجود کہلائے گا۔ اب ایک دوسری قوم کو لیجئے، اس کے نزدیک عالم اسماء و صفات کے عکس ہیں جو اعدام آئینوں میں منعکس ہوکر مختلف شکلوں میں رونما ہوئے، وہ اعدام جو ان اسماء و صفات کے بالمقابل ہیں، جیسے قدرت کے مقابلہ میں عدم کہ وہ عجز ہے تو جب قدرت کی روشنی عجز کے آئینہ میں منعکس ہوئی تو قدرت ممکنہ وجود میں آئی اسی طرح باقی صفات کا حال ہے۔ اس نظریہ کو وحدۃ الشہود کہا جاتا ہے۔"

غرض نہایت طویل بحث کے بعد حضرت شاہ صاحب نے ان الفاظ میں مولانا عبدالرحمٰن جامی کی رائے سے اتفاق کیا۔

"اسی طرح کلام مولانا عبدالرحمٰن جامی کا میرے نزدیک مسلم ہے کیونکہ ان کا مقصود نفی ہے اصل ہونا حقائق کا اس کے مقابل کہ وہ اعتبارات اور اضافات ہیں۔ ان کا مقصود یہ بتلانا ہرگز نہیں کہ وجود حق ظاہر ہوا اشیاء میں اور ان ہی کی وجہ سے اس کا تعین ہوا، نہ ان کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی ذات اور کائنات کا فرق محض اعتباری ہے۔"

بہر حال حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک درمیانی راستہ اختیار کر کے ان دونوں نظریوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کی اولاد اور ان کے متبعین و معتقدین نے ان کی روش پر قائم رہ کر ان دلائل کو جو شاہ صاحب نے پیش کی تھیں تقویت پہنچانے کی سعی کی، مگر شیخ مجدد کا اثر اتنا گہرا تھا کہ ان کے نظریہ کی حمایت کرنے والوں کی تعداد کم نہیں ہوئی، بعض نے تو اسی پر اکتفا کی کہ حضرت شیخ مجددؒ کے نظریہ کی مزید وضاحت کر دیں اور بعض اس حد تک آگے بڑھے کہ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اس توجیہہ کو ہی سرے سے مسترد کر دیا جو انہوں نے دونوں نظریوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے کی تھی۔ پہلے گروہ میں خواجہ میر ناصر عندلیب اور خواجہ میر درد ہیں۔ اور دوسرے گروہ میں حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ اور مولانا غلام یحییٰ بہاری ہیں۔

میر ناصر عندلیب نے "نالہ عندلیب" میں مجملاً نظریہ وحدۃ الوجود کی تردید کی اور صاف الفاظ میں اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا۔

وحدۃ الوجود سراسر غلط ہے اور وحدۃ الشہود قرین صواب ہے، گو حال و کیفیت کے اعتبار سے دونوں کا منشاء ایک ہو یعنی ماسوا سے نظر کا ہٹ جانا خواجہ میر درد نے اپنے پدر بزرگوار کی طرح وحدۃ الوجود کو کلیتاً غلط تو نہیں بتایا البتہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے معنوں کا تعین کر کے "عینیت" کے نظریہ کی تردید کر دی ہے اور اپنی اس توضیح و تشریح کے نتیجہ میں وہ تقریباً شاہ صاحب اور مولانا جامی کے ہم لاتے ہو گئے ہیں۔ خواجہ صاحب اپنے رسالوں

"واردات درد اور علم الکتاب" میں فرماتے ہیں:۔

"وحدت وجود کے فقط یہ معنی ہیں کہ موجود بالذات صرف وہی ہے اور یہ معنی نہیں کہ واجب اور ممکن کی ماہیت ایک ہے اور عبد اور معبود ایک دوسرے کا عین ہیں اور کلی طبیعی کی طرح اپنے افراد میں موجود ہے، کیونکہ یہ سراسر زندقہ ہے۔ ...... مذہب میں توحید وجودی کی بایں معنی کوئی اہمیت نہیں کہ وجود موجودات میں ساری ہے کیونکہ کثرت میں وحدت جو عوام کی زبان پہ ہے اور ہر ہندو جوگی بھی اس پر گفتگو کرتا ہے نیز اس کے لئے ایمان کی بھی شرط نہیں بالکل مبتذل مسئلہ ہے جو ذرا سمجھانے سے سمجھ میں آجاتا ہے، لہذا انبیاء کی بعثت کا مقصود نہیں ہو سکتا۔"

وحدۃ الشہود کے یہ معنی ہیں کہ ذات واجب کے بغیر موجودات ممکنہ کا وجود نہیں ہو سکتا اور موجودات اسی ایک ذات کے نور سے موجود ہیں۔ ... "کل من عند اللہ" کے مطابق ہمہ ازوست کی تصدیق وحی سے ہوتی ہے، اس لئے ہمہ اوست غلط ہے اور ہمہ ازوست صحیح ہے ... نتیجہ یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ نفس الامر کے اعتبار سے باطل ہے وحدت شہود حق ہے۔ لیکن کیفیت اور حال کے اعتبار سے دونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی قلب کا ماسوا کی گرفتاری

سے آزاد کرنا؟

دوسرے گروہ میں سے مولوی غلام یحییٰ نے اس موضوع پر نہایت شدومد سے بحث کی ہے اور حضرت شاہ صاحب کی پوری طرح تردید کر دی ہے وہ کہتے ہیں:۔

"شاہ صاحب کا یہ کہنا کہ وحدۃ وجود اور وحدۃ شہود حقیقت اشیا اور حادث و قدیم کے مابین ربط کو ظاہر کرتے ہیں اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا مطلب ایک ہی ہے سراسر غلط ہے۔ ان دونوں مسئلوں کے درمیان کوئی تطابق کسی طرح ممکن نہیں، کیونکہ وحدۃ وجود کی بنیاد عالم اور موجد عالم کے مابین عینیت پر ہے اور وحدۃ شہود کی رو سے واجب اور ممکن کے درمیان غیریت محض ہے"

غرض شیخ مجدد کے اثر سے یہ مسئلہ صوفیہ کے مابین بحث کا ایک اچھا موضوع بن گیا، جو لوگ نظریہ وحدت الوجود کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے ان کو بھی اس میں ترمیم ضرور کرنی پڑی، بعض نے تو حضرت شاہ ولی اللہ کے خیال کو بہ تغیر الفاظ پیش کر کے شیخ اکبر کے نظریہ کو محفوظ کرنا چاہا۔ مثلاً:۔

"وحدۃ الوجود کا یہ مفہوم نہیں کہ ذات خداوندی اور کائنات ایک دوسرے کے عین ہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ذات کا اثر اشیاء میں اس طرح ہے جس طرح شیرینی مختلف قسم کی مٹھائیوں میں[1]"

---

[1] سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ از وحید احمد مسعود ص ۵۰

بعض حضرات نے اس اعتراض سے بچنے کی کوشش کی کہ وحدۃ الوجود کا نظریہ فلسفہ و ویدانت اور نو اشراقیت سے ماخوذ ہے اور اعتراض کرنے والوں کو ان الفاظ میں جواب دیا :-

"یہ ذہن نشین کر لینے کے بعد کہ مسلمان صوفی عالم کو عین حق سمجھتے ہیں اور باقی دوسری جماعتیں عالم و موجودات میں گیر ڈالتی ہیں۔ یہ کہنا کہ مسلمان صوفیوں نے دیکھا دیکھی اس اصول کو مختلف نظریوں سے مستعار لیا ہے محض دھاندلی کی بات ہے اور ناواقفیت کی علامت ہے[1]"

عینیت کی یہ حسین توجیہہ بھی پیش کی جانے لگی ہے :-

"عینیت کے یہ معنی نہیں کہ مخلوق خالق کی ذات کی عین ہے بلکہ یہ مفہوم ہے کہ سالک بہ ہوش و حواس حالت صحو میں فنائے صفات بشریہ کے بعد عین الیقین اور اطمینان قلبی حاصل کرنے کے لئے تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ کیفیت وحدۃ الوجود کی طرف لے جاتی ہے اور چونکہ مشاہدۂ تجلیات عین الیقین کے درجہ میں رہ کر کیا جاتا ہے اس لئے وحدۃ الوجود کی بنیاد "عینیت" کہی جاتی ہے۔ وحدۃ الشہود سے علم الیقین حاصل ہوتا ہے اس لئے اس کی بنیاد "درایت" بتائی جاتی ہے[2]"

---

[1] سوانح خواجہ معین الدین چشتی ص ۵۲ [2] عبد الغفار خان صاحب۔

اور دونوں نظریوں میں مفاہمت کی اس طرح بھی کوشش کی گئی ہے :-

حقیقت تو وحدۃ الوجود ہی ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کو اپنائے بغیر معرفت خداوندی حاصل نہیں ہوتی، لیکن حالت عروج میں جب سالک خدا سے قریب ہوتا ہے اسے وحدۃ الوجود کو حق ماننا پڑتا ہے اور یہ سیر فی اللہ کا مقام ہوتا ہے اور جب حالت نزول میں سالک کو نظام دنیا کی غرض سے بندوں کی طرف لوٹنا پڑتا ہے تو وہ وحدۃ الشہود کہنے پر مجبور ہوتا ہے کیونکہ وحدۃ الوجود کہنے سے عوام کو غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ سیر عن اللہ کا مقام ہے"[1]

غرض اس ضمن میں طرح طرح کی تعبیریں اور توجیہات پیش کی جاتی ہیں لیکن بمصداق

ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

یہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے اور الجھ جاتا ہے اور حقیقت کا متلاشی شاعر کی زبان میں کہہ اٹھتا ہے :-

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے ؛؛ پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
یا اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ؛؛ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جیسا کہ سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے، نظریہ وحدۃ الوجود کو سب سے پہلے اس اہتمام کے ساتھ حضرت محی الدین ابن عربی نے پیش کیا تھا اور ان کے بعض

---

[1] عبدالغفار خاں صاحب۔

ہمعصروں نے اس کی اشاعت کی تھی۔ ان بزرگوں نے سرشار محبت ہو کر اس راز محبت کو فاش کرنے کی جراٴت کی تھی، ان سے پہلے منصور نعرہ "انا الحق" بلند کر چکا تھا لیکن اس کو ایک نعرہ مستانہ سمجھ کر کسی نے اس کا اثر نہیں لیا تھا، مگر ان حضرات نے اس کو جذب و مستی کی ایک کیفیت نہیں رہنے دیا بلکہ اس سر محبت کو اس انداز سے دنیا کے سامنے پیش کیا کہ بادۂ محبت کے متوالے اس کو صدائے حق سمجھ بیٹھے اور تصوف کی عنان اسی سمت میں موڑ دی گئی یہ عقیدہ خواص سے گذر کر عوام میں پہنچا تو اور بہت سے غلط تصورات قائم ہو گئے مسلمانوں کی عبادات، ان کی قوت عمل، ان کی جمالیاتی حس غرض سب چیزیں اس سے متاثر ہوئیں اور بعض گمراہ لوگوں نے شریعت کو علی الاعلان ایک ادنیٰ شئے کہنا شروع کر دیا۔ عبادت کا مقصد عرفان ذات کہا جانے لگا۔ نصب العین حیات معرفت خداوندی کو بنا لیا گیا جس کی وجہ سے عمل کی قوت میں ضعف پیدا ہو گیا، شعر و شاعری اور ادب میں اس نظریہ کی پوری طرح کارفرمائی ہو گئی۔ یہاں تک کہ اردو کا سب سے عظیم شاعر غالبؔ جو خود صوفی نہیں تھا لیکن جس نے تصوف کے مسائل کو واقفان راز کی طرح اپنے کلام میں جگہ دی یہ نظریہ پیش کرنے پر مائل ہوا۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

غرض زندگی کا دھارا تعلیمات اسلامی کی مخالف سمت میں مڑ گیا، مسلمانوں میں جہاد کی روح کمزور ہو گئی اور ان کے مزاجوں پر خانقاہیت کا غلبہ ہو گیا، رفتہ

رفتہ وہ سیادت و قیادت سے ہاتھ دھو بیٹھے، یہی وہ انقلاب تھا جس نے بقول علامہ اقبال مسلمانوں کی ذہنیت کو کلیتاً بدل ڈالا اور نظریہ وحدۃ الوجود امت مسلمہ کے لئے تباہی بغداد سے زیادہ مہلک ثابت ہوا۔

اس خرابی کا باعث درحقیقت نظریہ وحدۃ الوجود کی غلط تعبیر اور اس کا غلط محل استعمال تھا۔ جو چیز حال تھی اس کو قال بنا دیا گیا اور محرمان راز سے گذر کر یہ مسئلہ عوام تک پہنچ گیا جو اس کے کنہ و حقیقت کو نہ سمجھ سکے اور کیفیت کو حقیقت و اصلیت پر محمول کرنے لگے، صوفیا کرام نے یقیناً ذات خداوندی اور کائنات میں عینیت کو محسوس کیا ہوگا لیکن وہ ان مقدس روحوں کا حال تھا، انہوں نے اس کو وحدۃ الوجود کے نام سے تعبیر کیا یا وحدۃ الشہود کہا ان کے لئے دونوں طرح روا تھا، عوام نہ اس باریک فرق کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ انہیں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت ہے، ان کے لئے وحدانیت پر عقیدہ رکھنا فرض ہے۔ ضروری ہے کہ وہ وحدانیت کو اساس دین خیال کریں اور اسی کی روشنی میں ذات خداوندی اور کائنات کے تعلق کو سمجھیں۔ خداوند قدوس کو اپنا خالق و مالک سمجھ کر اس کے احکام پر چلنے کی کوشش کریں، یہی شریعت کا تقاضا ہے اور اسی راستہ پر چلانے کے لئے ہمارے ہادی سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ۃ

اِلہاماتُ الموجودُ الوَدُود

کے

تحقیق وحدتُ الوجود والشہود

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یافتّاح

ب ابیس بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وتمم بالخیر

سبحانک یا مَن کانَ موجودًا بوجودہ التسرمدی وکان واحدًا
مفردًا الوحدۃ التوحدی وکان علمہٗ بذاتہ لذاتہ
المتضمّن بصفاتہ المتحد لیۃ تابدی وکان متعالیًا فی
معارج القدس ولم یزل متنزہًا عن التنزل لتکثری
التعددی ثم تبرقع بالظہور والبروز الازلیۃ
بتمائز المراتب فی العوالم الامثال التجددی وما ثلوثت
نقطۃً وحقق بالوارث الممکن الدور لتمددی المتفردّی
ومتیز عن سائر نقاط المیمات الممکنات بتشرافتہ مطلعۃ
انوار جمالہ مع کمالہ فی مقام المحبوبیۃ نقطۃ المحمدی ہی
نقطۃ الاحدی ان نزالتنزل التغائر التعددی فصل
علی المحبوب المحمد الاحمد وآلہ وازواجہ و صحبہ
الذین ہم میزو برعایۃ التفریق بین المراتب بین
الوحدتی وتوحدتی۔

امابعد دوستدار عالم خاکپائے افراد بنی آدم ہیچ مچ زبان ہیچمدان درم
ناخریدہ و صاحبدلان عاشقان قلیل البضاعت والاستطاعت خدیم المعرفت

والصناعت از آستانہ بوسانِ صاحب معارف واسرار و متقیان پر توِ چلچراغ[1] انوار صدر الاولیاء والابرار قطب الامصار والاکوار[2] والباری والبحار شیخ المشائخ والاولیاء حضرت ولی نعمت مولانا میانجیو نور محمد صاحب جھنجھانوی لوہاروی قدس اللہ اسرارہ العزیز ونوّر اللہ انوارہ العزیز فقیر شیخ محمد تھانوی بن مولوی حمد اللہ خاں عمری فاروقی نسباً تھانوی میلاداً و وطناً صوفی صافی مشرباً چشتی صابری ونقشبندی مجددی سلسلۃً سید احمدی ولعقوبی ذنوری شعبۃً وحنفی مذہباً واسحاقی تلمذاً ابنغ جاں مترنم کہ چوں فقیر از مطالعہ اسولہ واجوبہ ورد وقدح یکے بر دیگرے والزام وتقریب تام فیما بین اسلاف کرام کہ یکے ملقب بہ لقب علینیہ ودیگر بوجودیہ بعض از فریقین بہ تلحید وتضلیل وتحمیق وتجہیل فیما بین بمبالغت پرداختہ در مسئلہ ذات پاک سبحانہٗ وصفات او وحدۃ وجود وحدوث عالم متردد وسرگرداں بود کہ بارخدایا سر دستۂ فرقۂ ورائیہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قطب ربانی اند وسالار قافلہ فرقہ علینیہ حضرت شیخ اکبر شیخ محی الدین محمد بن عربی وشیخ کبیر شیخ صدر الدین قونیوی معاصر حضرت مولانا روم وشیخ ثانی حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس اللہ اسرارہم آخر الامر بتاریخ ہفت دہم ذی قعدہ سنہ یکہزار ودو صد وشصت وسہ ۱۲۶۳ ہجری علی صاحب الصلوٰۃ والسلام بعد نماز تہجد در مکاں

---

[1] ستونے را گویند کہ دراں طاقچہ بسیار باشند ودراں چراغاں روشن کنند وبالفعل بیشتر بر مزارات اولیاء اللہ عوام روشن می کنند

[2] جمع کورہ بمعنی قریہ صغیرہ وقصبہ نیز گویند۔

معظمہ شرفہا اللہ تعالی اندریں اندیشہ پیش باب السلام نزد زمزم ومقام ابراہیم بترتیب تفکر بدیدہ تربیت حل مشکل بحضرت قدس مراقب شدیم بفضلہ تعالی از عالم غیب بر دل فقیر این تقریر ریختند خواست کہ این عنقاء قدسی را بدام سطور در قفس عنصر تحریر بندکند وچون دراین عالم بجز اسم عنقا ہیچ مسمی یافتہ نمی شود ناچار بہ الہامات الموجد الودود فی تحقیق وحدۃ الوجود والشہود نام نہاد

الہام اول تصویرش آنکہ ذات پاک یعنی ذات مطلقہ از قید اطلاق وتقید وبانواع تعین کہ تعبیر وبیانات ونسب واضافات ووہم وادراک وتعینات واشارات را درآنجا رسائی ممکن نہ باشد وہیچ پرندہ پر زدن وہیچ گردندہ گرد گردیدن نمی تواند این قسم تعین بے کیف کہ عبارت از وجود است کہ بفارسی ہستی نامند وعین ذات است از قبیل الفاظ مترادفہ فی حد ذاتہ لذاتہ بے شائبہ غیر بالاستقلال بہ بساطت در بساطت موجود است بوجود واجبی وثابت شدہ بثبوت ذاتی چہ ثبوت خیر محض است فی شر محض است و امتداد زمان را کہ موہوم است وحیز مکان را کہ معدوم چہ یارائے کہ متوجہ بہ جناب قدس شوند وذات پاک دراول الاوائل ومبدء المبادی وازل الآزال وآخر الاواخر وابد الآباد وظاہر الظواہر وباطن البواطن تسرمدی دارد کہ مرکز نقاط ماضی ومنتہی نقاط مستقبل منقرض ومنقطع کہ خبر پیغمبر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کان اللہ ولم یکن معہ شیٔ از ینقسم استمرار وثبوت وتحقق و وجود ووجوب ہستی گویا است ونیز حدیث سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کان اللہ فی عماء اگرچہ علماء ظاہر رحمہم اللہ از روئے لغت عماء را بمعنی ابر تنک تفسیر کردند ولیکن نزد فقیر این معنے مطابق حقیقی بدلائل وشرح ماسبق محال فاما بمعنی خفاء

عن الغیر است یعنی این ذات پاک مخفی بود از غیر و موجود و ظاہر بود فی حد ذاتہ لذاتہ کہ بدیں تقریر از حسن انتظام معنی آیت کریمہ ھوالاول والآخر والظاہر والباطن نیز بر متوقدین منضح خواہد گشت و در آنجا ذکر صفات قدیمہ کہ عین ذات اند و بر ذات مرتبہ نہ دارند فضول نمایاں شد بلکہ (صفات واجبیہ ازلیہ) لبطریق

۱؎ خصوصًا صفت علم کہ بمثابہ خانہ صفات است کہ در فہم یک حقیقت ثابت مثلاً ارادہ موقوف است بر علم و تخلیق و ترزیق موقوف بر ارادہ پس ہماں ذات مرید است کہ عین علم بود و ہماں ذات رازق و خالق است کہ عین علم بود. تعدد محمول است نہ در موضوع و ایں چنیں تعدد محل وحدت ذات نباشد. فاعل و حمل صفات بر ذات سوائے تغائر اعتباری کہ اقتضاء وضع لفظی آں را در مفہوم باعث باشد ہیچ شئے دیگر پیدا نمی کند چنانکہ زید عالم است و کاتب است چہ ظاہر است کہ مفہوم لفظ عالم دیگر است نہ کہ شئے موجود دیگر است کہ صفت علم برائے زاید باشد بلکہ عالم ہماں ذات ماخوذ بصفت علم است و ہم چناں مفہوم کاتب و عالم دیگر الا ہماں ذات است ماخوذ بصفت کتابت و بصفت علم پس در عالم و علم و ذات و کاتب تغائر اعتباری است چنانکہ در متعالج و معالج یعنی شخصے علاج خود می کند پس ہماں ذات است کہ علاج می کند ہماں ذات است کہ علاج می کنانند ناچار در مفہوم تغائر است و اصلاً در ذات نیست پس ایں معنی و حیثیت صفات حق تعالی را مجازاً غیر او گفتن روا باشد و باں حیثیت عین او گفتن عین حق است و مبحث در ایں جا نیست ۔

بلکہ ذاتیہ فی حدِ ذاتہٖ لذاتہٖ بغیر ملاحظہ امر خارجی و عوارض ذاتی اند و الّا تعدد قدماء بس کہ منافی مطلوب است اعنی وحدۃ لازم می آید بوئے شرک ہم ازاں، چنانچہ بلا مداخلیہ کسب و اکتساب وصف تہوری در اسد عین اسدیت است و الّا اشتعالی است محض و محض تمثیل برائے تفہیم است تعالی اللہ عن ذالک علواً کبیراً۔ اگر ایں چنیں ہستی نہ باشد عین نیستی است تعالیٰ شانہٗ و تقدس و آنکہ بعض عرفاء مثل حضرت شیخ ثانی شیخ محب اللہ الہ آبادی وغیرہ از متقدمین و متاخرین گفتہ کہ ذات بحت موجود نباشد بلکہ بہ صفات موجود است کہ عین ذات اند کما نحناہ الآن و اگر کسے قائل بنفی عینیت صفات و غیریت بیرامنہا بودہ مرتبہ توسط یعنی لا عین ذات و لا غیر ذات ثابت کردہ تسامح است و الّا نیک بداند کہ در میدان مناظرہ ثبوت قدم فشردن پائے سوئے قول بتسامح دیگر صورت نمی بندد و تسامح امرے است مجازی و از مبحث ما بیرون است چہ سخن در حقیقت است فاما حق ہمیں است کہ گفتہ شد۔

الہام ثانی:۔ وجملہ ممکنات کہ معدوم محض بودند در صفت علم ازلی او تعالیٰ و تقدس بطریق وجود ذہنی نہ بطریق وجود عینی کہ مورث حلول و اتحاد باشد نعوذ باللہ منہا ثبوت بے کیف بہ تفصیل تمام می داشتند کہ آں را ثبوت علمی

الہام ثانی

ملہ وچوں بظاہر تقریر حضرت ثانی یعنی محب اللہ الہ آبادی وغیرہ قدس سرہم بسبب دقت و لطافت روحش می نماید چہ معرکۃ الآراء است لہٰذا در بادی النظر مانوس نمی شود۔

نامند یعنی بغیر مادہ کدام عنصر و بلا صفت امکان معلومات ذات اقدس بودند ودر مرتبہ علم ازلی ثبوتے بے کیف می داشتند بغیر آنکہ عین ذات حق باشند نہ ذات مطلق را ازاں تلوثے بودہ باشد بلکہ غیر حق باشند حقیقتاً و مفتقر باو بودند۔ ایں جا قدم معلوم لازم نمی آید بلکہ قدم صفت علم ثابت می شود و چوں صفت علم امرے است اضافی پس کدام معلوم بودن پر ضرر لہٰذا عالم بطریق ثبوت علمی معلوم علم شدہ کہ راز ازل بر وجہ دیگر پس افتقار صفت علم بعالم لازم نیاید[۱] و جملہ عالم کہ امرے ست خارجی و مفتقر بمادہ امکان بلا شک و بلا شبہ وجودے دارد بوجود امکان غایت مافی الباب وہمی باشد چنانکہ مذہب شیخ اکبر است قدس سرہٗ و مسبوق بالعدم است ناچار حادث است و نیز بدیہی است کہ وجود ذہنی امرے است آخر و وجود عینی امر الیست آخر چہ مثلاً آتش کہ در مرتبہ ذہن و ادراک حاضر باشد تاثیرش ممکن نہ باشد نہ ذہن را ازاں خرقہ باشد ورنہ آتش را ازاں چیزے تبدل چہ از قبیل مکتنفات ذہنیہ[۲] است پس ہویدا گشت کہ معلومیت آتش دیگر و نفس آتش دیگر ہمچناں معلومیت عالم دیگر و نفس

---

[۱] و از معلومیت عالم بہ نسبت علم و بطریق وجود ذہنی افتقار علم ہیچ گونہ لازم نمی آید لیک چرا کہ ہر چیز اثر امکان و عدم وغیرہ بلیش مرتبہ علم حاضر اند چہ صفت علم ہمیں است ورنہ نقص بہ حضرت علم لازم آید حاشا اللہ فتنہ۔ [۲] بخلاف آنکہ در مرتبہ عین و خارج باشد پس معلوم شد کہ در ذہن امر علمے ست گویا ایں انتقاش در حقیقت صفت علم است نہ کہ صفت آتش ہمچناں عالم ہمگونہ قد علم شد ایں نمی تواند گفت

عالم دیگر، اگر معلومیت عالم بطریق ثبوت در علم قدیم در مرتبہ قدم آمد عالم چگونہ قدیم باشد، شتان ما بینہما اگرچہ عند البعض معلوم و علم واحد است و علم کہ صفت قدیم است و عین ذات است ازیں جا قائل بقدم عالم و اتحاد عالم شدہ اند سراپا سوء فہمی است چہ علم ہرگاہ بمعنی مصدری ملحوظ باشد البتہ معلوم و علم مرادف باشد لیکن تا نیز مدعا شاں برآمد نمی شود چہ علم بایں معنی مغارق است از مادہ و عالم مفتقر است باو فلما چوں علم بہ معنی حاصل بالمصدر باشد بمعنی دانش و دانست عبارت است از حالت انجلائیہ[1] مرادف معلوم ہرگز نہ باشد بلکہ مرادف ثبوت علمی ہم نباشد پس منشاء مادہ سوء فہمی اتحاد عالم کہ اصلش عدم است شرارت و خبث ذاتی است بہ علم کہ عین ذات است کہ خیر محض است و نیز قدم عالم منجسم شد۔ فاما تقریر[2] دفع ایں ایراد ملحدین مخالفت با مذہب حضرت شیخ اکبر قدس سرہ و من تبعہ ندارد چہ شان او قائل بغیریت و موجودیت غیر سوائے ظل وہمی نشدہ اند تا قدم عالم و اتحاد او باحق تعالیٰ و تعدد قدما لازم آید بلکہ عالم نزد اوشاں عبارت است از ظہور حق در خارج بکسوت ظل موہوم کہ کثرتے پیدا کردہ است مانند ذات بحر و موج آں و نہ با مذہب حضرت مجدد قدس سرہ چہ اوشان قائل آمد بغیریت بوجود ظلی در خارج و مظہریت و ظہور صفات با عکوس آنہا نہ کہ بقدم غیر حق و استقلال او پس وحدت نزد شیخ اکبر قدس سرہ ایں چنیں است و نزد حضرت مجدد قدس سرہ ایں چنیں و ہمیں است

---

[1] کہ منشاء انکشاف و مبدء فیاض است۔

[2] یعنی ایراد قدم عالم و اتحاد او باحق تعالیٰ شانہ۔

حقیقت اعیان ثابتہ تقریر دیگر چنانکہ وجود آئینہ فی ذاتہ لذاتہ موجود است و
بوصف محاکات اجسام و اجرام بغیر حلول و اتحاد کہ ایں صفت آئینہ جوہر اصلی
است و عین اوست اگر ایں حیثیں آئینہ نباشد سفالی است محض بمقدار و
ایں جوہرش کہ اصل آئینہ است قرینہ بر آں آئینہ ندارد و جملہ ممکنات در وے منتقش می
شوند بوجود ثبوتے نہ بوجود عینی پس معلوم شد کہ آئینہ معہ جوہر خود بغیر کدام
ملاحظہ و کدام حیثیت زائدہ یا متاخرہ کہ آں جوہر عین ذات اوست قبل وجود
اجسام منتقشہ موجود باشد و انتقاش آں ممکنات بیش ایں صفت محاکات قبل
وجود آنہا ثبوتے دارد بہ تفصیل تمام کہ انتقاش ایں اشیاء بایں نقش و نگار بود
نتواند ازیں امر قدم جوہر آئینہ کہ عین آئینہ است منقح شد نہ کہ قدم اجرام منتقشہ
ازیں جاست۔ منشاء بد فہمی ملحداں کہ بقدم عالم قائل شدند نعوذ باللہ منہا۔
تعالی اللہ عن ان یکون لہ شریک فی الملک و یکون لہ ولی من
الذل و نحن نکبرہ تکبیرا۔ تدقیق دیگر چوں عالمیت ازلیت او تعالی شانہ
بذاتہ لذاتہ و عارفیتہ او بذاتہ و محبیت او بذاتہ لذاتہ و عاشقیتہ او بذاتہ لذاتہ
بے شائبہ غیریت محض از تقاضائے کمال ذاتہ لذاتہ بمشابہ شخصے کہ فی حد ذاتہ کمال
صفتے از صفات دارد بے شائبہ عجب و غیرہ از اغراض دنیہ کہ لائق کاملین
و مکملین نباشد در کمال خود در حج نگرد و بر ایں اکتفا نمی کند بلکہ آئینہ در پیش نہاد
و نگریست نوع تغائر اعتباری پیدا کردہ آرائش جمال با کمال را مطالعہ فرمودہ
گنجینہ عشوہ و ناز و نیاز خود را در خود برائے خود در کشود عشاق جواہر ممکنات عدمیہ
کہ در زاویہ خمول مکنون بودند از کتم عدم بیروں آمدہ بر کتف وجود حدوث

زمان ومکاں کہ عبارت از وجود خارجی اند سوار شدند وبہ شور وشر ظہور آوردند تو گوئی قیامتے برخاست ومنسوبہ مضمون حدیث شریف کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق برانگیخت[له] کہ عارف رومی حضرت مولانا جلال الدین محمد قدس سرہٗ می فرماید ؎

گنج مخفی بد ز پُری جوش کرد | خاک را سلطان اطلس پوش کرد
گنج مخفی بد ز پُری خاک کرد | خاک را تابان تر از افلاک کرد

وہر یکے حسب استعداد خود وقابلیت خویش کہ دراصل خود میداشت مظہر آثار صفات حق برآمد ابلیس لعین وتابعین او کہ در ثبوت علمی مائل بشرارت عدم بودند مؤد ومظہر صفات قہریہ وجلالیتہ گردید وآدم علیہ السلام وتابعین او کہ مائل بہ خیریت وجود بود مظہر صفات لطفیہ وجمالیت گردید کہ ان اللّٰہ خلق آدم علیٰ صورتہٖ ازاں خبر میدہد وتشارک اصلی انداین عالم اشباح میلان وتواتش بر واحد جانب جنس خود است ونفرت وتناکر از جنس غیر کہ خبر خلاصہ کائنات صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان الارواح جنود مجندۃ فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف وکریمہ الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات والطیبات للطیبین والطیبون للطیبات شاہد است بداں ومولانا روم قدس سرہٗ تضمین این مضمون فرمودہ ؎

[له] واشہر ومعتبر آنکہ از کلام حضرت داؤد علیہ السلام است۔

طیّبات آمد زبہر طیّبین ؛ الخبیثات الخبیثین است ہمیں
ناریاں مر ناریاں را جاذبند ؛ نوریاں با نوریاں لس دل خوشند

وفرد کامل از افراد ممکنات خلاصہ اعیان ثابتہ احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم برآمد وخلعت محبوبیت در بر پوشید وایں فرد کامل را محقق از نسبت ذاتی واظہار فضل او بر دیگراں بغیر شائبہ افتقار برگزید ومظاہر شیون کاملہ خود فرمود بہماں ہمنوبہ عشق بازی کہ در اصل نگراں جمال باکمال خود بذاتہ لذاتہ است پرداخت کہ ان اللہ لغنی عن العالمین بداں مشعر است یعنی ذات پاک در وجود واجبی خود غنی است از عالمیان کہ ہیچ قسم افتقار خود ندارد چنانکہ وجود کلی طبیعی احتیاج دارد بسوئے وجود افراد خود ومقید است بایں قید کہ ایں چنیں عقیدہ کفرے است صریح نعوذ باللہ منہا تعالیٰ ان یکون مفتقراً الی احد من المخلوقات فی وجود ذاتہ وصفاتہ ھی عین ذاتہ ؎

شاباش آں صدف کہ چناں پرورد گہر ؛ آیا ازو مکرم وانباء عزیز تر
صلّوا علیہ ما طلع الشمس والقمر

واز ہمیں جا منشاء کج فہمی ناتواں بینیاں بر خاست کہ بقدم عالم قائل شدند۔
الہام رابع۔ وفرق در احمد واحد کہ یک نقطہ میم است وآں ہمیں فرق است کہ در الہام ثالث بہ تحقیقش پرداختیم وحرف میم احمد عد حاصل بر بودنش از قبیل ممکنات اعدامیہ کہ آں میم در عدم ہم موجود است ودر امکان نیز موجود ودر محمد نیز موجود دلالت صریحہ دارد وتفصیل مقام ولایت احمدیہ بر ولایت محمدیہ علیٰ صاحبہما افضل الصلوٰۃ والتزکیہ او ہمیں سر است چہ در مقام احمدیہ ایں حرف میم کہ جزء

اعظم ایں کلمات است غیر مکرر است و در مقام محمدیت مکرر است چوں اقتضاء
ایں نقطہ ملحوظ کردہ شود جانب قدس امکان مائل است چہ اصل اوست وچوں
ایں نقطہ غیر ملحوظ باشد وانوار قدس متلاشی گردد آں نگاہ جانب قدس وجوب مائل
باشد کہ عین لسینہ بہ درگاہ وجوب است وہم منوبہ عشق بازی است طلسمے پیدا
کردہ است کہ عقل عاقل کار نمی کند کہ آیا از امکان است یا از وجوب۔ چنانکہ آہن
پارہ در آتش باشد واز آثار او متاثر گردد و بزبان جمال گویا است کہ منم آتش
وچوں آثار او بسبب بعض غلبات اصل خبث الحدید کہ عین اصالت آنست
باز عود کند ہیچ آثار آتش یافتہ نمیشود۔ چنانکہ شجرہ موسیٰ صلوٰۃ اللہ علیہ نبینا
علیہ السلام نار می نمود وبہ ترانہ انّی انا اللہ مترنم بود ازیں حال حکایت می
کند وہمیں را قرب فرائض وقرب نوافل کہ رموزات وما رمیت اذ رمیت
ولکن اللہ رمٰی وبی یسمع وبی یبصر کنت سمعہٗ وبصرہٗ الیٰ
مرضت فلم تعدنی وانی جعت فلم تطعمنی وامثال ایں ہا از آیات و
اخبار وآثار در شرع شریف وارد اند تواند گفت جائے غور است کہ چوں کمترین
ممکنات از نباتات را منقسم کلمات متکلم شود چگونہ درحق بشر کہ منصب خلافت
بحکم انّی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ دارد مستعد باشد۔ والعبد عبدٌ و
ان ترقی والرب ربٌ وان تنزل ودر تاخر میم در عدم ودر مصدر شدن
در ممکن بآں میم اشارہ است ع

کز فرق مراتب نہ کنی زندیقی

بداں کہ ہر ممکن آخر بعدم خواہد رسید کہ ممکن را از عدم چارہ نہ باشد واوّل

ممکن نیز ہماں میم عدم است پس بلحاظ بودن ممکن لعدم یہ ضرور است بلکہ از قسم عدم است اگرچہ بظاہر متوہم الوجود است فاما در وقت ملاحظہ واجب الوجود معدوم است چہ ہر شئی بالفعل گویا ہالک است کہ کل شیئ ہالک الا وجہہ ازاں خبر میدہد و وجود این بینین وجود کہ مابین العدمین باشد سوائے عدم چہ باشد چنانکہ طہر مابین الدمین حیض می باشد و ہر یکے از اولیاء و انبیاء حسب منصب خود و میلان خود بالوار قدس کہ در وی نوشی ہماں صاف نوش بطفیل یافتند موافق خمار آں مست بودہ بمنسوبہ عشق بازی می پردازند و قربت و نزدیکی باحق می جویند و ہمچناں موافق میلان خود بجانب اصل خود کہ عدم است محجوب بحجب و مستور باستار میشوند کہ آں را تعبیر کردن بہ قبض و بسط می توانند پس اگر موسیٰ علیہ السلام بر مسند موسائی نشستہ چوں ید بیضاء روشن شد ہم بطفیل عصا ہماں فرد کامل است کہ مراد ازاں نقطہ محمدی است و اگر آدم علیہ السلام دم خلافت زد بخلعہ نفخت فیہ من روحی سرفراز شد بطفیل روح پر فتوح ہماں فرد کامل است و اگر نوح علیہ السلام بتاج عبداً شکوراً سر برافراشت بطفیل حمد و مقام محمود ہماں فرد کاملست و اگر داؤد علیہ السلام بنوازش نغمہ ہا دلکش نواختہ شد بطفیل و نوازش حروف و صوت خطبہ او است و اگر عیسیٰ علیہ السلام باحیاء اموات زندہ دل شد بطفیل آواز نفخ دم جاں بخش او است و اگر ابراہیم علیہ السلام درجہ و مقام پیغمبر است صلعم قربت خلت یافت و بطواف و صلوٰۃ آں خانہ قریر العین شد بطفیل طاق محراب ابروآں قرۃ عینین جملہ اعیان ثابت است یا رب صل علیہ و سلم دائماً ابداً فقیر گوید

او چو نقطہ مرکز و ما دائرہ ایم ؎ گرد او ہر وقت سرگرداں رویم

مفلسیم و بایکہ ما زر داریم ؎ در پئے آں ساقی خمار آئیم

و یارب صل وسلم علیہ۔

الہام خامس۔ و ہر کسے حسب دستور او وقابلیت خود کہ در الہام رابع گذشت ماخوذ و معذوب و ماجور و مشکور و ایں جبر و ظلم نیست بلکہ معنی جباری است چہ جملہ اعدام ممکنات کہ بہ ظہور آمدہ و ہر یکے موافق حوصلہ خود مرتبہ پیدا کردہ است مملوک حق اند ہر چہ خواہد کند کرا مجال کہ دم زند پس اگر کسے را خواہ در عالم اشباح خواہ در عالم مثل خواہ در عالم ارواح ہر چہ خواہد از تنعیم و تعذیب حکم فرماید عین فضل است و عین عدل چہ بدیہی است کہ ہر چہ ہست مملوک وے است و در ملک خود ہر قسم کہ تصرف باشد ظلم نباشد بلکہ ترسیدن ازیں و گفتگو کردن در چنیں مقام اگر ظلم باشد مضائقہ نباشد چنانکہ محقق عارف مولانا روم اندریں ہمی معنی می فرماید ؎

الہام خامس

کوزہ گر گر کوزۂ را بشکند ؎ چوں نخواہد باز د آہم می کند[1]

بلکہ رضا جویان حق را از جنت و نار چہ کار کہ غیر حق است الا بطریق وسیلہ رویت حق و لقاء او بلکہ مرتبت قطب ارشاد بغیر حصول ایں قسم رضاء او و تسلیم عنایت نمی شود

---

[1] اس جگہ حضرت رابعہ بصری کے وہ اشعار بے ساختہ نوک قلم سے ٹپک پڑتے ہیں جو کسی اور موقعہ پر درج کر دئے گئے ہیں:۔

گر پرستش کردہ ام از ترس نار ؎ بے تکلف سوز در دوزخ چہ خار
ور برائے ضم ہستاز بہر بہشت ؎ کن حرامم آں گلستان وبہشت

که اگر حکم باد خال نار علی التابید و التخلید به نسبت وے صادر شود بکشادہ پیشانی
چنانکہ در جنت رود و در نار داخل شود ہر چند دل می خواہد کہ خود بہ خود سخن از لب
بہ تراود فاما از اقتضاء اختصار ایں رسالہ بعید است تا نیز ایں قدر بطریق جرعہ
از غدیر کبیر کافی است۔

الہام سادس۔ پس چوں آفتاب جمال احدیت ظہور فرمود و شعشانیت او
ہر چار سو ممکنات را فرا گرفت کہ و کان اللہ بکل شیئ محیطا ازاں خبر می دہد تا چار ہر
ظاہر را مظہرے باید چنانکہ ظہور ذاتہ لذاتہ بود ہمچناں ہماں ظہور ذاتہ لذاتہ عکس
ظہور ذاتہ لغیرہ بدیں منوبہ پیدا کرد، پس ہر شیئ ممکن مظہر تجلی ذات پاک او گردید
و ہر مظہر از مظاہر ازان تجلی موافق حوصلہ خود خاکے شد پس در آئینہ علم ذات
پاک ایں اعدام ممکنات بدون مواد عنصر و تشخصات عینیہ خود ہا مانند آئینہ چنانکہ
بالا گذشت ثبوتے پیدا کردہ اند۔ و ذات پاک را ازاں اصلا تلوثے نشد تو گوئی
در بادی النظر متحد اند۔ نعوذ باللہ منہا۔ و فی الحقیقت غیر ذات اند۔ ہم چناں تجلی ذات
پاک برایں ممکنات ظہور فرمود۔ و مظاہر خود قرار داد۔ و خود از تلوث آنہا منزہ۔ نہ ممکن
صفت واجب پیدا کرد۔ و نہ در واجب از صفت ممکن ہیچ نقصانے اثر کرد، چنانکہ
تابش آفتاب بر سائر اجرام ممکنات تجلی خود می نماید۔ و اشراقیہ بداہا ارزانی میدہد۔
فاما از طہارت و نجاست آنہا بے شبہ مبرا و مستغنی است و از جملہ ممکنات
آفتاب تجلی ذات پاک بر حقیقت محمدیہ علیہ السلام کہ بمنزلہ آفتاب است۔ در سائر
کواکب تجلی فرمود۔ اینست معنی توحید وجودی کہ بر فقیر از عالم غیب ریختند
تعالی عن الحلول و الاتحاد و عن الکون و الفساد ہو واجب الوجود موجود

بذاتہ سبحانہ و تعالیٰ عمّا یقول الظّالمون علوّاً کبیرًا۔

الہام سابع۔ چنانکہ برظاہر است کہ نور جملہ اختران از نور شمس مستفاد است چوں نظر باصل نور افتد۔ لاجرم ہر اختر تاریک شود چوں نظر بہ اختراں افتد البتہ حقیقت اختراں نوعی نورانی باشد۔ فقیر گویدؔ۔ چوں شمس نبود ہر یکی روئے نمود۔ چوں شمس طلوع کرد گوئی کہ نبود۔ شاعری گوید ؎

رات کو محفل میں ہر ہر پارہ گرم لاف تھا
بزم میں وہ شمع رو نکلا تو مطلع صاف تھا

ہم چناں چوں برکسی آفتاب وحدت طلوع کند۔ نظر لوقی شہود او در مشاہدہ مستغرق گردد و متحیر شود۔ بالضرور ہر شے رابلکہ ہستیٔ خود را ہم گم کند۔ وسوائے مشاہدہ واحد و غیر وحدت نمی بیند۔ چنانکہ سوائے شمس دیگر ستارہ رانمی بیند چہ ہر چیز حتی النفس خود را نیز مستہلک پیش نور آفتاب وحدت داند بلکہ ایں دانست خود را نیز دراں حالت را باستغراق تعبیر می کنند۔ چنانکہ بہادر شاہ بادشاہ عہد ما اندریں معنی میگوید

کچھ نظر آیا نہ جب کہ تو نظر آیا مجھے
جس طرف دیکھا مقام ہو نظر آیا مجھے

فاما حق آنست کہ ایں حالت در وسط سلوک منکشف می شود کہ ایں را وحدۃ الشہود خوانند۔ و سالک مذکورہ بالا آں را وحدۃ وجود خوانند۔ کہ منتہی سلوک است و برہر سالک مکشوف نمی شود و کشف نمی شود۔ تا آنکہ جمیع حجاب منخرق نشوند و جماعت بلند پایہ صوفیا رحمہم اللہ فرمودہ اند کہ ہفتاد و ہزار حجاب اند۔ فاما حق آنست کہ چوں حق تعالیٰ خواہد۔ و کسی را قبول فرماید۔ درآں واحد طے شدن حجب چہ دشوار

الہام ۷

کہ چوں جذبہ از جذبات حق وکششی از کششات ربّانی مطلق در رسد۔ مثنوبہ عشق بازی مانند بہ آتش طور در حق موسیٰ علیہ السلام بداں گیرند۔ او را جمیع اغیار بلکہ از خودی خود وارستہ کناند۔ وبطرفۃ خود در کشد۔ رزقنا اللہ واکثر عنایت خداوندی متکفل نشود ہیچ نیست۔ چنانکہ عارف رومی یعنی مولانا روم قدس سرہٗ می فرماید بیت بے عنایات حق وخاصان حق گر ملک باشد سیاہستش ورق۔ چوں سامعان محجوب وکثیف می بودند البتہ در تحریر ایں حجاب ہائے بے حجاب می شد مگر العاقل تکفیہ الاشارت۔ لہذا پردہ داشتم۔ ووجہ افضلیت کشف حالت وحدت وجود بر کشف حالت وحدت شہود آنست۔ چہ وحدت شہود مراد ازاں است ہستی واحد دیگر را بلکہ خود را نیز گم کند۔ ووحدت وجود آنست کہ در کثرت وجود واحد بیند۔ و نظیرش بہ شمس وستارہ ہا دادیم۔ پس انصاف باید کرد۔ کہ تیز بین و دوربین کدام است۔ یعنی آں کس کہ سوائے شمس نہ بیند۔ چہ شمس را ہر کدام ضعیف البصر خواہد دید۔ آنکس کہ وقت عروج آفتاب جمیع ستارہا کہ نورشاں از آفتاب حقیقتاً مستفاد است۔ بیند و داند کہ سبحان اللہ چہ آفتاب است کہ ہر جا موجود است وہر یک را فیض می بخشد۔ وہر یک نہ منفصل است و نہ متصل۔ نہ در کسی حال است نہ بجائے کسے محل است۔ و نہ در وجود خود مقید است در کسی۔ بلکہ ہر یکے را ازاں وجود است و نور انیتی است۔ و نہ از کسی ایں آفتاب را تلوثے است۔ و در ضیاء خود و انوار خود نہ محتاج است بکسی۔ پس گویا ایں ہمہ کہ ہمہ اند ہیچ اند۔ اگر ایں آفتاب نباشد۔ فرضاً ایں ہمہ ہیچ اند۔ واگر ایں اختران نباشند او را ہیچ نقصی نیست چنانکہ بود ہماں است۔ و ہمچناں خواہد ماند۔ پس تا ایں مرتبہ بعنایت حق طالب حق میرسد

عجائب می شود۔ پس انصاف را از دست نہ باید داد۔ کہ آیا ایں حالت منتہی سلوک است۔ یا آں حالت پس یکسر سوئے بالا ازیں مقام ارتقاء کردن مناسب معلوم نمی شود حضرت سلامت فقیر گوید

لنگ لنگاں من قدم بر داشتم ؛ مغز چیدم استخواں انداختم

ایضاً :

من نمی گویم بجز تعلیم حق ؛ کو بناشد خلق را کام و حلق

ونیز بزرگی گفتہ در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند۔ آنچہ استاذ ازل ریخت ہماں می گویم۔ فاما حق آنست کہ تا نیز مثال آئینہ از شش جہت حیرانم۔ وجیب تمنا ہمی دارم کہ لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار ولیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع العلیم۔ وسبحان ربک رب العزت عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للّٰہ رب العلمین۔ پس ہر عامی را سزاوار نباشد کہ دریں مقدمات بی تامل بسخن در آید و در حق بودن مسئلہ وحدت شہود و وحدت وجود بانکار نہ آویزد۔ تا کہ ماخوذ بوبال و نکال نگردد۔ و نہ از علماء ظاہر علماء باطن بد عقیدہ گردد۔ و خود را بقلت درایت منسوب کردہ سپرد بخدائے تعالےٰ کند۔ و تا کشف حقیقت بہ قول علماء ظاہر کہ از اہل سنت والجماعت اند عمل کند۔ و از جماعت بلند پایہ صوفیہ بدگمان و طاعن در حق ایشاں نشود۔ ایں نکتہ کافی است۔ چہ کاملاں را نکتہ کافی و نا اہلان دفتری نا وافی کہ اللّٰہ مرقدہ قدس سرہٗ فرماید کار پاکاں را قیاس از خود مگیر۔ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر۔ و ایضاً کار پاکاں را کہ کیفیت نہد۔ ایں کہ گفتم از ضرورت می جہد و شاعری گوید قلم بشکن سیاہی ریز کاغذ سوز دم در کش۔ حسن ایں قصہ عشق است

دردفتر نمی کند فقیر گوید ؎

صد ہزاراں غرق شد ابن السبیل

بحر بے پایاں نہ ہیچو رود نیل

وازیں تحقیق منشاء تضلیل و تجہیل وتحمیق فریقین فیما بین واضح شد۔ والکل من الفریقین مجتہد فالمجتہد یخطی و یصیب ما دام کان طالباً للحق فلہ من الحق نصیب۔ وفریقین ہیچوموجہ آں را اصل وظل خارجی در خارج قرار نہادہ اند۔ وفقیر ایں چنیں نظائر را وعلاوہ برآں دیگر امثلہ آوردہ ودر دیگر الہامات آئندہ می آرد والّا بہر حال مآل واحد است۔ حسنک واحد والعبارات مختلف فقیر می گوید۔
ع شاہدے یک عشق بازاں صد ہزار۔ وایضاً بجز ما عبدنا نگوئیم پس سوائے ما عرفنا نگفت است کس بحمد اللہ اولاً و آخراً۔

الہام ثامن۔ فاما ایں ہمہ تحقیق و تدقیق درحق طالب عافیت طلب کہ از موشگافی می گریزد۔ وموئے برتن برمی خیزد اسلم وانفع آنکہ چوں ہر گاہ لفظ مبارک اسم ذات پاک جل جلالہٗ از کسے شنود۔ یا نویسد یا بیند یا خود گوید یا درخاطرش خطور کند یا در اندیشہ گذرد۔ غرض بہر حال ہر کس فراخور حوصلہ خود خواہ ذکی باشد خواہ غبی خواہ عامی باشد خواہ عارف خواہ شاغل خواہ غیر شاغل آنچہ کہ معنی بسیط مجرد فوراً بلا تامل می فہمد۔ وبے تردد درخاطرش درآید۔ درحق آں کس ہماں مفہوم مجرد بسیط مفہوم ذات پاک است تعالیٰ و تقدس ایں قدر مسلم الثبوت است و معرا است از کاوش بحث و تفکر و مطابق است بہ خبر السرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم برائے مصلحت وازمر سدراہ فتنہ خام طبعان ومحجوبان فرمودہ کہ

لا تفکروا فی ذات اللہ و تفکروا فی آلاء اللہ و صفات اللہ نیز روایت وارد است چہ حق تعالیٰ شانہٗ روبروئے ہر کس خواہ غبی باشد خواہ ذکی بمرتبۂ معبودیت تجلی فرمودہ است و علاوہ بر آں در حق او شان تکلف کردن است. فاما از پیش عارفان ایں حجب الفاظیت ہر دم مرتفع اند و حسب حوصلہ خودہا در مفہوم بسیط مجرد مستغرق اند. واللہ اعلم و احکم چوں نوبت بایں رسد مضمون کل شیءٍ ہالک الا وجہہٗ بطریق معنی حال نہ بطریق معنی استقبال کہ علماء ظاہر می فہمند یعنی ہستی ممکن پیش ہستی ذات واجب مستہلک است بالفعل و در حال بروے محقق شود و از اینما تولوا فثم وجہ اللہ در معنی کلمہ طیبہ باقتضائے مراتب لا موجود الا اللہ آگاہی یابد۔ گو ایں قدر امر از سر حد توحید وجودی در رسد. واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب.

الہام تاسع تنقیح مسئلہ وحدۃ الوجود بایراد تماثیل دیگر از برائے تسہیل و تفہیم و تعقیل اولاً باید دانست. کہ بلاشک و بلاشبہ مسئلہ وحدۃ وجود کہ عبارت است از وجود واحد ساری در ہر ذرہ از ذراری الصفت اطلاق از جمیع قیود معہ حفظ مراتب چہ اگر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی خواہ واجب باشد خواہ ممکن خواہ جوہر خواہ عرض خواہ قدیم خواہ حادث وغیرہ در ہر درجہ موافق درجہ آں یک وجود است حفظ مراتب ضرور یعنی در واجب واجب و در ممکن ممکن. ایں مسئلہ بر حق است کہ آیات و[1]

---

[1] چنانکہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ ہمیں مضمون بتصریح گفتند.

احادیث بے شمار و اقوال و آثار خارج از حد و حصار است که اطناب در آن لائق
این تحریر مختصر نیست لهذا بر اسرع ترین آیات اندرین باب که سنریهم آیاتنا
فی الآفاق و فی انفسهم الخ و اینما تولوا فثم وجه الله و خبر فخر کائنات آنسرور
صلی الله علیه وسلم لو القیتم الحبل علی الارض السابع لهبط علی الله که در جامع
ترمذی مروی است اکتفا نموده شد که الجرعة تغنی عن الغدیر و الحبة تحکی عن البید الکبیر
هر چند شاهد اقتضاء لیس کمثله شیء و هو السمیع العلیم با وصف ظهور بر وجه
کمال در سر اوقات جلال متواری است مستکن است فاما شورش خاطر که
خو کرده مذاق گفت و شنود است بے اختیار می جوشد که از سر باطن بپائے ظاهر
در آویزد که مر لیست تا گزیر سودائے است علاج ناپذیر تمثیلش آنکه مثلاً وحدت
فی حد ذاته لذاته معرّی از نسب و اضافات و عارضیت و معروضیت مابه الواحد
که عین وجود واحد است و مصدر جمیع مراتب اعداد است نه که وحدت مصدرة
و آن مراتب اعداد منتزعه از آن وحدت و صادره از آن که در قوت باسطه واحاطه
باسطه آن وحدت ثابت بودند از آن وحدت در خارج امتیازی و تغایری بوجود
خارجی پیدا کرده اند آن قدر بساط و بساطت و استمرار در استمرار دارد که جانب
عدد و معدود بود و خواهد بود یعنی ماضی و مستقبل در آنجا نسیاً منسیاً معدود چه عدد
و زمان از عالم ترکیب است و ادنی رتبه ترکیب اثنینیة است دیگر ظاهر است
که در واحد ترکیب را دخلے است و نه تحلیلے را و اما بودن عدد و معدود از عالم
ترکیب ظاهر است و ترکیب زمان از راه اجزاء آن نیز ظاهر است و عالم
است از آنکه خواه ترکیب عینی باشد چنانکه در معدود است خواه علوی باشد

خواه سفلی و معدود عام است از آنکه مادی باشد یا مفارقی مجردی یا ترکیب ذہنی باشد چنانکه عدد وزمان و لہذا واحد مصداق تعریف عدد نیست چه عند الحساب تعریف عدد نصف مجموع حاشیتہ مقرر است و بدلائل تحقیق ماسبق ثبوت حواشی و مجموعیت که مستلزم ابتداء و انتہا و اجزاء است و منافی بساطت است ایں جملہ در مرتبہ وحدت بکقلم بالمرہ منتفی است وچہ یارائے کہ بجز انتفا خود دیگر ثابت کند و ایں قدر وحدت واحد ممتنع التعقل است چہ از معقول اول است نہ کہ از معقولات ثانیہ الاجہول الکیفیہ است ۔ چوں ایں قدر مقدمہ مناط تقریر مہد شد سمع گوش ظاہر را گوشمالی دادہ بگوش ہوش باطن بحکم او القی السمع وھو شھید باید شنید چوں واحد خواست کہ لیے چونی بچونی در آمد در مراتب کسوت اعدادیہ حکمتہ تنزل نمود و در ہر چہ موافق اقتضاء آں مقام کسوۃ متأخر کسوۃ اول پوشیدہ بلا احتیاج سوئے آں مراتب حکمتہ و بغیر استکمال باں مراتب بل محض ازراہ اظہار کمالات خود و تفضل یکے بر دیگرے کہ عین مصلحت تامہ کہ قالہ عبثیتہ ولغویت فعل است کہ وما خلقنا کم عبثا مؤید ایں معنے است از شانے بہ شانے دیگر جلوہ نمود کہ کل یوم ھو فی شان و ان اللہ لغنی عن العالمین و ھو الاول و الآخر و الظاھر و الباطن و اشباہ ایں آیات بینات بدیں ناطق اند و لفظ یوم درایں جا معنئ آن" است نہ کہ آن من کہ از اجزاء زماں باشد چہ زمان را سابقاً منقح کردہ ایم کہ از عالم ترکیب است و خود مخلوق است بلکہ مراد از آن آن بسیط است کہ استمرار در استمرار و تسرمد در تسرمد خبر می دہد کہ بمنزلہ شی واحد است کہ عبارت است از ازلی کہ بلا ابد باشد و اولیسان شروع

شریف گاہے بدہر تعبیر فرمودہ کہ در خبر فخر کائنات سید المرسلین صلعم است لا تسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ یسبنی ابن آدم بیت الدھر وانا الدھر بیدی الامر اقلب اللیل والنہار یعنی منہم سرمدی فاعل مختار قہار لیل ونہار و تقلیب لیل ونہار شانے است از شیون کہ در مرتبہ کسوت اجزاء عددخارج تنزل پیدا کردہ فافترقا یعنی فرق درمیان دہر و درمیان زمان کہ اجزاء زمانیت متجزی است واضح شد تعالیٰ علواً کبیراً پس ازیں جامنشا مذہب معطلہ کہ بہ تعطیل افعال ذات پاک درجانب ماضی قبل خلق السموٰت والارض قائل شدند باطل شد وہمچناں مذہب آن کسان ناکساں کہ بہ تعطیل افعال حق تبارک تعالیٰ درجانب استقبال کہ بعد فیصلہ اقوال وافعال واحوال روز قیامت قائل شدند (نعوذ باللہ) نیز باطل شد الحمد للہ کہ ہر دو عقیدہ باطلہ از اوج گمان فاسد[1] شان بحضیض بطلان مطمورہ نشین گردیدند متنبہ و استحکم واللہ اعلم واحکم۔

۱ الہام عاشر۔ مثلاً عدد عشرین کہ بست ہمان واحد است کہ دریں کسوۃ عددیہ خارجیہ در خارج تنزل نمودہ کہ بظاہر متکثر است وبہ باطن متوحد است دریں مرتبہ ترکیب عددیہ وبروز ظہور آں قدر بساطۃ وکمون وبطون پیدا کردہ کہ لا تدرکہ الابصار وہو یدرک الابصار تلویحی است ازاں بگر ادراک اکتناہش کما حقہ از حیطہ ادراک خروج دارد مگر بہ نظر غائر مجملاً بلاشک وشبہ عار وحدت پیدا است کہ از قسم اولیات وبدیہیات است چنانکہ شعلہ جوالہ در عالم

الہام عاشر

---

[1] فاسد۔

گردش باوجود اشیاء متعدده از قسم مادیات از آتش و پنبه و شمع و موم و چربی وغیره آن قدر بساط پیدا کرده که سوائے کرۂ آتش دیگر نمایاں نباشد اگر آتش است — آتش است اگر پنبه است آتش است اگر چوبے است آتش است اگر شمع و موم است آتش است و اگر گردنده است آتش است گردانده است آتش است هرچه که هست آتش است. باوصف تعداد اشیاء سوائے وحدت هیچ نیست و هر مرتبه ازیں امور از دیگرے امتیاز کلی دارد مگر وحدت درایں مراتب بآں روش تنزل نموده است که صورت تخیل کثرت و تعدد باشد و از تنزل معنی حلول و اتحاد و اتصال که متبادر فهم بعض نافهمان است ازاں اصلاً گرد نه گردیده است چه حلول و اتحاد و اتصال مقتضی دو چیستن و جسمین باشد و از جسم کردن ماده فاسده ایں قسم توهمات اولاً فراغت یافتیم که قائل بوحدت شدیم الکیه همان وحدت است که از شانے به شانے تنزل نموده است و در خارج موهم کثرت گشته که اقتضاء ایں مرتبه همیں است چنانکه نزد هیئین در فن هیئت متقرر است که چوں آفتاب در هر برجے از دوازده بروج می گذرد شکلے پیدا می کند مانند اسد یا حوت یا سرطان یا دلو وغیره علی هذا القیاس در هر برج و لهذا آں مقام باییں اسماء منقسم شدند همان عکس و ظل آفتاب است که به نسبت اقتضاء ایں مقام ایں اشکال متخیل شدند و در اصل هیچ نیست سوائے آفتاب واحد همان آفتاب است که هر یک اشکال دریں منازل ظهور کرده چنانکه اقتضاء مرتبه صرافت وحدت

مطلقہ است کہ در اصل مرتبہ خود منافی این وہم است۔ اگر شرح آفتاب این مقام وحدت عزمیت اشراق کند صفحہ آسمان کثرت موہومہ چون برف گداز فرالله باقی من کل فان۔

الہام حادی عشر۔ پس اگر کسی ببیند کہ عدد عشرہ دہ آحاد اند بایں لحاظ درست است و اگر کسی ازیں کثرت قطع نظر کند گوید کہ ہماں واحد است ہماں وحدت است۔ بایں لحاظ ایں ہم صحیح است۔ علی ہذا القیاس ہر مرتبہ از مراتب اعداد حکمنہ ہمیں حکم دارد کہ آنرا از وحدت چارہ نباشد و در اصل وحدت از تراحم این کثرت موہومہ اعتباریہ در ہر مراتب مرتبہ از اعداد حکمنہ مفارقہ وغیرہ از امور مجردہ چہ از قسم روحانیات وچہ از قسم نورانیات وچہ از قسم حرکات و سکنات اجزاء رہانیات ہیچ نقصانے عائد نمی شود تا کہ در منش عصمت دامنش را تلوثے ہم رسد و ہم چنان وحدت در معدودات است کہ وابستہ اند بجمادات اچہ از قسم عنصریات وچہ از قسم فلکیات۔ ھلمّ جرًّا من دونہا الی ہا و من این الی این ومن وضع الی وضع ومن طور الی طور مثلاً از عشرہ تا مئات و از مآت تا آلاف و از آلاف تا لکوک تا آخر عدد پس بعد تنزل و ترکیب اعداد متکثرہ موہومہ فیما بین کہ بظاہر صورت عروج پیدا کردہ در رسد نا چار بحکم ما عندکم ینفد وما عند الله باق کہ لمن الملک الیوم لله الواحد القہار۔ صورت نفاد یابد و راہ تنا ہیدہ معدود شود کہ قل لو کان البحر مدادًا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددًا۔ بتباینیت مدلل حاکی است بآن چہ متناہی را باغیر متناہی ہمسری

کردن چہ یارائے، پس ہماں وحدت نازلہ در مراتب ممکنہ کہ وجود آنہا عین معدوم
و موہوم بود۔ وصورت حباب پیدا کردہ رو بہ ہستی نمودہ بود بحکم آنکہ وجود میکہ
مابین العدمین باشد، بمنزلہ عدم باشد، چنانکہ طہر درمیان دو حیض حکم حیض
دارد، بعد تحلیل اجزاء عددیہ ممکنہ موہومہ کہ عکس ہماں وحدت است موجود
خارج بہ بساطت در بساطت آن کما کان موجود است کہ ہیچ تلوث و نقصے
و خللے و سرایتے و عیبی بباعث آں کوہ کثرت وانبوہ پیدا نکردہ چنانکہ بود
بود و آں کثرت اعتباری موہومی کہ از شیونات آں وحدت عبارت است
کہ نابود بود و بہ خارج نمودہ بود نیست و نابود شد۔ فقیر گوید ؎

آپ نے آپ کو جانا تو نے جاناں تو نے ؛ جان دی تس پہ غضب ہے کہ نہ مانا تو نے
ہر زماں شان نئی دیکھتے ہیں تیری ہم ؛ ہے نئی لیک کیا ہم کو پرانا تو نے
جوشش عشق میں بلبل سے گوائے وہ راگ ؛ اور سکھلا دیا بلبل کو ترانا تو نے

پس دریں جا کہ مکان لامکان است و از منزلہ اقدام است و محیرہ اذہان سوائے
وحدت دیگر چہ باشد۔ چہ قول بہ حلول و بہ اتحاد و عارض و معروض و تابع و متبوع
و متمکن و مکان و زمان و احیان و کم و کیف و موضوع و محمول و اشتقاق و
مواطات و اثنینیت و لمیت و قید و اطلاق و عموم و خصوص و ایجاب و سلب و دخول
و خروج و ملازمت و شروط و مشطور و کلی و جزئی و اسناد و افراد و ترکیب و وضع
و اہمال و تلفظ و اعجام و قصر و ایجاز و اطناب و اسہاب و استصحاب و عکس
و قلب و انشاء و خبر و حد و اوسط و نوع و جنس و فصل و تحلیل و تعاکس و تعدیل
و امثال ذلک کہ ایں جملہ از معقول ثانوی است و دریں جا اناول تبع وحدت

ازلیه گردن دوئی و مغایرت بریده است که درین مرتبه صورت مرتبه اثنینیت و غیریت در خواب چه بل در تخیل عکسے ننداخته چه درین جا صورت صورت ازین نقش ساده است مگر در مراتب متنازله این چنین امورات از قسم معقولات ثانیه بآں روشن البته معقول می شوند که بساطت و وحدت و صرافت او بلا تلوث ازین مراتب ممکنه و بلا استشمام اکتساب این مراتب قدم وحدت و توحد و وحدت فی حد ذاته لذاته ملحوظ ماند ورنه از لوث زندیقیت ملوث باشد نعوذ بالله منها و این چنین ظهور و وحدت را در خارج از خزانه مکمن غیب که اشارت است به کنت کنزاً مخفیاً عالم و ما سوی الله و غیر الله نامیده اند چه این چنین مراتب عین مرتبه واحد نباشند بلکه بشکلے دیگر ملحوظ اند فقط۔

الهام ثانی عشر۔ و از همین جا است، منشاء تخالف ظاهری فرقه عینیه و فرقه ورائیه که سابقاً تصریح اوشان کرده آمده ایم۔ پس فرقه عینیه که رئیس اوشان یعنی حضرت شیخ محی الدین بن عربی قدس الله سره العزیز اند۔ ازین چنین کثرت اعتباری و شیون متعدده متنوعه قطع نظر فرموده اند۔ وجود و ظهور آں را وهمی قرار داده اند نه که حقیقی۔ پس ناچار بے اختیار قائل شدند که همه اوست یعنی اگرچه در توهم همه اند مگر در حقیقت اوست و بر ظاهر است که روبروے وجود حقیقی وجود وهمی را اعتبارے چه باشد که همسنگ او شود و بایں اعتبار این سخن بیجا نیست بلکه عین حق است که هو الاول والآخر والظاهر والباطن و اینما تولوا فثم وجه الله و انا اولیات بلا موجه است و برائے دفع شبهه محجوبین که می گویند اگر عالم وهمی الوجود است چرا از قوت عقل مانیست و نابود نمی شود و بایں تحقیق فرموده اند که[1] در دفع این

---

[1] در دفع این توهم قوت عقل کارگر نباشد چوں تحقیق تجلی است فقیر بشرح ولیست میگویند

توہم بغیر ازالۂ دوئی کہ در بحر وحدت عین گرداب است وورطۂ ہلاک بالیقین محال و دوئی بغیر تخزیق حجب ولصفیہ تکدرات محال وتخزیق حجب ظلمانیہ بغیر اشراقیہ آفتاب وحدت بر روزنۂ جان محال وانفتاح روزنۂ جان بغیر تربیت وتنویہ نور جان جان وتنویہ آں محال ونور جان جان از عالم قدس است کہ محض برائے تخزیق حجب است وآں مرتبہ دوئمی است از مراتب نازلہ کہ مرتبہ اثنیت حقیقی است ومرتبہ واحدیت اضافی کہ واسطہ است درمیان واحد حقیقی ودرمیان سائر اعداد ممکنہ ومعدودات ممکنہ چوں فی الحقیقت از قسم اعداد ممکنات است۔ لہذا واحد حقیقی شدن نمی تواند ودر چوں در سلسلہ اعداد معدود است رتبہ اولیت پیدا کردہ است وبمنزلہ واسطہ فیما بین واحد حقیقی وسائر اعداد نازل است۔ لہذا ثانی حقیقی است وحقیقت ایں عدد باعتبار دیگر مراتب عددیہ است کہ جملہ متوہم الوجود اند وحقیقت متوہم الوجود از حقیقت وہمیت نباید چہ خواہد کرد شد پس حقیقت ایں عدد نیز وہمیہ است۔ پس اصلا اشتباہ نباید کرد کہ حقیقت ثانی ناقص وحدت وجود واحد حقیقی شد۔ آں واسطہ بمنزلہ عینک است پیش واحد حقیقی برائے ملاحظہ جمال خود در سائر اعداد ممکنات کہ بذریعہ آں نور قدس الواحد حقیقی برائے ملاحظہ جمال خود در سائر اعداد ممکنات کہ بذریعہ آں نور قدس۔ الواحد حقیقی بہر کہ ومہ جلوہ می فرماید وبہر یکے نادر تبعض رسانی از انوار عنایت ارزانی میدارد۔ پس کسانیکہ فی الحقیقت بواسطہ آں عینک می توانند دید وکسانیکہ نابینا مادرزاد اند ویا بسبب بعض عوارض عینیہ استعداد وقابلیت استینار آن نور نمی دارند چگونہ توانند دید بعض ازیں قسم آنانند کہ

بعد از معالجہ تواند دید و بعضے ازیں استعداد بے بہرہ ازلی شدہ اند۔ نعوذ باللہ منہا۔ دیدن اوشان و انخراق حجب اوشان از نظر خیلی متعذر بلکہ محال کہ کریمہ انک لاتهدی من احببت الخ وذالك هدى الله يهدى به من يشاء الخ و خبر سرور کائنات سید المرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم من اصاب من ذالک النور اهتدی ومن ضلّ اخطاء بیانی است شافی ازاں کہ آں واسطہ را عین اعیان ثابتہ نامند کہ افضل و اکمل اوشان است و آں عبارت است از ذات بابرکات خلاصۂ کائنات سرور انبیاء والمرسلین محبوب رب العالمین محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلوٰۃ اللہ علیہ وآلہ کہ سائر انبیاء و رسل خوشہ چیں آں ثمرہ دوحۂ باغ محبوبیت اند و چوں ایں نقطۂ اثنینت احمد و احد حائلہ فیما بین از نظر عارف برخیزد۔ لاکلام در حق او ایں چنیں کلام کہ بہت شعر است ع

خواہ احمد گوئی خواہ گوئی احد ۔ نیست فیما بین غیر ایں نقطہ حد

مباح باشد چہ در احمد ہماں وحدت بسیط است مگر دریں جا در مرتبہ ممکن متنزل است و در احد در مرتبہ اصلیت خود در مرتبہ واجب است و در مرتبہ واجب و ممکن فرق است۔ ہمہ فرق کہ العبد عبد وان ترقی والرب رب وان تنزل یعنی چوں حجاب ہا از نظر عارف برخیزند و بمرتبہ قصویٰ معارف برسد آنگاہ در کثرت وحدت می بیند۔ الا بفرق مراتب یعنے در واجب واجب و در ممکن ممکن و در جوہر جوہر و در عرض عرض مصرع

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

ہمیں حقیقت است مسئلہ وحدت وجود کہ بر حق است۔ فاما خام طبعان و نارسایاں

بسبب غموض این مسئله منکر می شوند و معتقدان این مسئله را که از قضایا مسلّمه بدیهه است، مگر بعد رفع حجب بشرط استعداد نور مذکور تکفیر و تضلیل می کنند. و آں بزرگواران از وشان اغماض می فرمایند. چه ایشانان نابالغ اند و از نابالغان عاقلان بر حرکات ایشانان نابالغ اند. و از نابالغان عاقلان بر حرکات ایشانان گرانی نمی فرمایند. و عین صواب است مصرع

چه قلندر هر چه گوید دیده گوید

مصرع :. هیچ آدابی و ترتیبے مجو

فاما غیر عارف را ہمیں سیّم قائل است چنانکه در حق عارف عین نوش دار و است پیش نااہلان و محجوبان این قسم تقریر مشابه آنکه پیش نابالغان خواندن اشعار مشتمل بر اسرار عشق مجازی باشد. مصرع ذوق این می نشناسی بخدا تا نچشی فقط۔

الہام ثالث عشر. و امّا فرقۂ ورائیہ که سالار قافلۂ شان حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ اند. بعینیت وحدت بایں چنیں کثرت قائل نشده اند بلکه بنسبت ظلّی و عکسی پیدا کرده اند و وجود خارج را وہمی نه فرموده اند بلکه تحقیقی، چنانکه شایان امکان باشد نه شایان وجوب لہذا ناچار ہمه از وست قائل شدند۔

الہام رابع عشر. مخالفه فیما بین آنکه یکے را با دیگرے در اصل مقصود یعنی در وحدت وجود و وجود کثیره ہیچ مخالفت نیست که مخالفت کلی است تا مخالفت اصلی لازم آید و میدان تطبیق با وجود فراخی تنگی نماید بلکه مخالفت در فرع است، یعنی در کیفیت کثرت که آیا موہومه است یا متحققه بطرز تحقیق بتبعیت یا متبوع و این قسم مخالفت در مقصود اصلی مخل شدن نمی تواند. پس آنان که نظر بمآل کردند

قائل بکثرت موہومہ شدند و توہم سوائے در مرآۃ قوت متوہمہ روشنے نہ موجود و حال متوہمہ ظاہر است کہ از وجود نا استشمام نیافتہ ناچار قائل بہمہ اوست شدند و آنانکہ نظر بہ تلبیس حال کردند، قائل بہ تحقیق آن کثرت شدند بر روش قیام ظل بادی ظل چنانکہ در تابع بالمتبوع خود انتساب است و چون ظل را در خارج مستقل نیافتند بسبب تحقیق این یافت گو مرتبہ ظلی است و این تحقیق البتہ وجودے غیر وجود ذی ظل کہ وجود مستقل است میدارد قائل ہمہ از وست شدند و این قسم مخالفت در مقصود اصلی مذکور شدن نمی تواند بلکہ این تخالف مشابہ آن تخالف است کہ فیما بین ائمہ مجتہدین مثل حنفیہ و شافعیہ و مالکیہ و حنابلہ واقع است کہ در حق این قسم تخالف لفظ رحمت از زبان شارع صلعم صادر است کہ اختلاف رحمۃ یعنی این اختلاف در فروع عین رحمت است کہ ہر یکے بشرط اخلاص ماجور است نعوذ باللہ منہا چہ جائیکہ این اختلاف باعث ضلالت باشد کہ یکے بر دیگرے حکم تکفیر و تضلیل نماید، و اقدام بر این معنی خالی از نافہمی و تعصب نباشد و مثال این چنین اختلاف فرعی از اختلاف کیفیات است نہ کہ اختلاف ذات چنانکہ صاحب ذوق افیون را باوجود حصول سکر کہ مقصود جملہ نشہ خواران است ادب از دست نمیرود کہ مقتضائے کیفیت این سکر غیر این نباشد کہ مولانا روم فرماید ؎

انبیا در محصوم پاک آمد ملک ؛ ور ادب پر نور گشت است این فلک

وصاحب ذوق خمر پائے بند ہیچ سر رشتہ و آداب و پاس نمی باشد نہ کہ مقتضائے این سکر ہمین است و سوائے این نباشد کہ مولانا روم قدس سرہٗ فرماید ؎

چون تو مستم کردہ حدم مزن ؛ شرع مستان را نیارد حد زدن

بسبب این اختلاف کیفے اصل مقصود که سکر است مختل نمی شود و چون اینیایان حجاب را در پیش داشتند خود را نورانیہ نام نہادند و اوشایان چون بسبب نرو فتی نشہ خود حجاب برداشتند خود را لعینیہ مسمی کردند که مولانا روم فرماید ؎

چونکہ بیرنگی اسیر رنگ شد ❊ موسئی با موسئی درجنگ شد

چون بہ بیرنگی رسی کان داشتی ❊ موسیٰ و فرعون دارند آشتی

در نظر ناتوان بینا انکار مسئلہ وحدت الوجود بہ نسبت حضرت مجدد قدس سرہٗ می گردد خلاف واقع است که ازیں تدقیق محاکمہ ہویدا شد پس حال این ہمہ گذارا متن این چنین داند که بمنزلہ اسدین اند و ما محجوبان بمنزلہ شغالان در روبہا د.... انو نخچیران اند فیمابین ہرگز ہرگز نیفتد مباد از صدمہ ناخن رو تے ہستی نور دل ما بہ ہیئت نیستی متبدل شود ؎

رمز عاشقاں عاشق بداند ❊ چہ او داند که اشتر می چراند

حق آنست که ملتزم مذہب عینیہ راہیچ دقتی و اشکالی رو نماید و ملتزم مذہب و رائیہ البتہ خلجانی باقی ماند صرف در تعبیر ند که درباقی الضمیر چہ ظاہر این ہر دو فرقہ نسبت ولی ولد و باطن الشایان در حقیقت مجمع النور واحد است چنانکہ حجاج را راہ ہائے مختلف در پیش می آیند و در محل مقصود یعنی مکہ معظمہ و بیت اللہ متحد باشند پس ظاہر بایان چشم بند و بہ باطن الشایان دل در بند فقیر می گوید ؎

بے عینک کو ہے کیا دیکھے حقائق کے تئیں ❊ مجمع النور تو واحد ہے نہ جانا تو نے

پس ہر سفلہ و کمینہ که صاحب ذوق بودن امری است دیگر از مذاق صاحب ذوق ہم مذاق ندارد و از فریقین زبان طعن و تشنیع دراز می کنند آن احوال است که واحد را

دوئی بندد، درباره مدعی وحدت است که لا نفرق بین احدٍ من رسله حجتی است برآن با برهان قاطع و مر این بزرگواران را البته رتبۀ علماء ورثۀ انبیا مستحق است پس بلا تامل سخن کردن بجز باد پیمودن دیگر نیست. اقول هذه الاسرار لا یکشف علی المتعصبین والاغیار چنانکه این معنی مولانا روم صاحب مثنوی معنوی میفرماید

نکته‌ها چون تیغ پولاد است و تیز ؛ گر نداری تو سپر واپس گریز
پیش ازین الماس بی اسپر میا ؛ کز بریدن تیغ را نبود حیا
زین سبب من تیغ را کردم غلاف ؛ تا که کژ خوانی نخواند بر خلاف

واللّٰه اعلم واحکم

الهام پانزدهم

الهام خامس عشر. وهم ترین قیاس تمثیل شجره و تخم آن در وحدت صرفه و تکثر آن و استشمال آن از ابتدا بر هر رگ و ریشه و برگ و ثمر وغیره از امور منکثره خارجیه زینبه باید تصور باید توضیحش آنکه چون این تخم به اظهار صفت کمالات اصلیه خود که در خود از خود از قدیم می داند و این دانست عین اوست این چنین دانست او خویشتن را از وی منفک شدن جانب امکان تطرق نیافته که خارج از مقدور اوست بغیر احتیاج و بلا استکمال کمال بسوئے غیر بلکه محض برائے اظهار تماشاء فیض رسانی است و مخزن آن کمالات خانۀ علم اوست که عین اوست توجه نمود بالضرور از شان وحدت و صرافت بسیط خود شانے دیگر که عبارت است از نهانی که معدوم بود بر سطح امکان که مسبوق و مغلوب همان عدم صورتے بر روئے کار آورده این هر دو نقیضین نیز یعنی عدم جامع از قدیم در خانۀ علم آن تخم بمرتبۀ معلومیت ثبوتی می داشتند پس همان تخمے است که از وحدت خود روئے بکثرت آورد علی هذا القیاس انجم کل یوم هو فی شان همان تخم

بسر باوج کثیرہ در کشید و سطبری و قوتے گرفت شانے دیگر مغائر شان اول پیدا
کرد و ہم چناں بعد آں شان انشقاق اغصان و دیگر شاخہائے خورد و کلاں و بعد
آں شان تلبس برگ و ثمار وغیرہ وبعدہ پختگی آں ثمار تا حالت لاتق التناول و بشیون
متغائرہ نیرنگی د بوقلمونی و تلمعہ گونا گونی و رنگ آمیزی و کارسازی با چندی و چونی
ظہور نمود باز بعد طے ایں مراتب شیون متعددہ ہماں تخمی است کہ موجود بود آں
مراتب شیون متعددہ متغائرہ را ہیچ عاقلے فضلاً عن العاقل ہیچ نا بالغے عین
آں تخم کہ در مرتبہ صرافۃ خود بود نخواہد گفت بلکہ خواہد گفت ایں ہماں تخم و نواۃ
است کہ چہار رنگار رنگ دقائق مندمجہ خود را بہ شیون متکثرہ تمائزہ تلبس و تبرقع
نمودہ تماشا خود می بیناد کہ ایں جملہ شیون و مراتب شئ وحدت آں را شئے
مانع نمی تواند شد چہ تکثر اعتباری و وہمی و انقلاب شانی گو و لو فرضنا وجودی
دارد خواہ وہمی خواہ تحقیقی لطبہ لیتیا ظل علی سبیل المذہبین مزاحم وحدت حقیقی نمی
باشد چہ اگر کسے مثلاً ہمیں شجر را از دور بیند یا از متصل بشرط بہ نظر امعان و در
آں شرط تابع شدن حواس ظاہری متبوعات خود را کہ حواس باطنی اند و محکوم
تدبیر نفس ناطقہ اند البتہ سوائے وجود واحد بسیط آں شجر کہ تخم است دیگر از شاخ و
ثمرہ نخواہد دید اگر ثمر است آں وقت ہماں تخم است و اگر برگ است ہماں تخم
است و اگر شاخ است ہماں تخم است اگر تخم است ہماں تخم است و حاشا از
آنکہ ایں مراتب شیون اعتبار بہ عین مرتبہ تخم باشد یعنی نباشد بہر کہ ایں چنیں مراتب
را ملحوظ نہ دارد البتہ زندیق است نعوذ باللہ منہا و علی ہذا القیاس چوں ایں مقدمہ ذہن نشین
شد بہ لفظ بحر و موج آں و کل و ظروف آں و سائر امثال بے باید برد ہر چند

بحر جان ناتواں بہ ایضاح ہر امثلہ جوشش می زند فاما موجب فضولی است و در
این مختصر نیز طاقت تحمل آں ندارد و موجب ملالت و کسالت طالبین است لہ
بحکم آں کہ ع چو پیش آید نشاید گذشتن بہ سیل بہ بند آب پرداختیم۔

الہام شانزدہم

الہام سادس عشر ظہور شان نہاں شدن آں نواة و مانند آں را اثبات
منقح بود دیگر متفرعہ برین قاعدہ بمنزلہ اعیان ثابتہ باید تصور بود انہمیں جا است
قائلین لہذا القول لا یصدر عن الواحد الا الواحد یعنی کسانیکہ قائل اند کہ
از واحد سوائے صدور واحد دیگر ممکن نباشد۔

الہام ہفدہم

الہام سابع عشر توضیحش آنکہ یعنی در سلسلہ انقلاب شئون بدیہی است کہ
شان واحد بشان دیگر سوائے شان واحد انقلاب متصور نباشد چہ شان عبا
است از ظہور حالت بسیط واحدہ لا تجزیٰ لہذا و ظہور دو شان در آں واحد از
محالات است اگرچہ آں شان لو فرضنا افراد خود کثیرہ دارد تا نیز بدیں لحاظ از وح
و بساطت خود پائے بیروں کشیدن نمی تواند چہ اجتماع افراد شئی واحد فی حالت
واحدت ممتنع نباشد زیرا کہ افراد متمائز الشخصیت و النوعیت آں قد
تکثر و تعدد پیدا نہ کردہ اند کہ بالکل مغائر باشند و چوں فردے از اف
متمائز الحقائق مداخل خواہد شد البتہ حکم متبدل خواہد شد چہ تعدد و تکثر حقیق
رو خواہد نمود آں وقت البتہ انقلاب شانے بہ بشانے دیگر بالضرور خواہد بود اگ
حق آنست کہ حاجت بذکر این واہمہ مستخیلہ نبود چہ فرض المحال محال الا آنا نہ
دفعاً للتوہم المتوہمین این خدشہ باضافہ کردیم مثلاً تخم در شان نہاں در آ
بالضرور درختہاں و ... در شان تنہ کامل بسطری و درازی و بالائے نخواہد

چه شان امرے است آنے نه استقراری و در امر آنی تعدد و تکثر ممکن نباشد چوں تعدد و تکثر خواست که رو نماید همیں امر را شان دیگر و متغایر گوئیم بحکم لا یصدر عن الواحد الا الواحد که کل یوم هو فی شان حجتی است بر آں چوں ایں مسئله نازک تر و از مزلة الاقدام است قدم نهادن دریں مقام گراں تر است و اکبر موانع حلول ایام تسکیه است که روز اختتام ایں الهامات غیبیه بست و پنجم ذیقعده ۱۲۶۳ھ هجری هزار و دو صد و شصت و سه هجری علی صاحبها افضل التحیات و اکمل التسلیمات است و ابتدا تحریر ایں تسوید تاریخ هفت دهم ماه مذکور سنه مصدوره البیان است و تاریخ اختتام تبییض ایں ها پنجم ماه ذی الحجه سنه مصدوره و ابتدا تبییض بست و ششم ماه ذیقعده سنه مذکوره پس لهذا المانع فقیر تحریر تحقیق ایں مسئله به رساله مستقله منحصر داشت ان شاء الله بعد لحوق باوطان بمنصه ظهور خواهد آمد. الحمد لله اولاً و آخراً و ظاهراً و باطناً

اللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ۔

تمت

— × —

کتابیات

—x—

۱۔ ارشادِ محمدی (مولانا شیخ محمد تھانوی) (۲) ارواحِ ثلثہ

۳۔ انوارِ محمدی (مولانا شیخ محمد تھانوی) (۴) بیاض حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی

۵۔ تذکرۃ الرشید (مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ)

۶۔ ترجمہ شرح حزب البحر (مولانا فتح محمد تھانوی) (قلمی)

۷۔ رسالہ عطاء المنان (مولانا احمد اللہ مظفر نگری) (۸) رودِ کوثر (شیخ محمد اکرام)

۹۔ سرکشی ضلع بجنور (سر سید احمد خاں) (۱۰) ۱۸۵۷ء کے مجاہد (مولانا غلام رسول مہر)

۱۱۔ سوانح قاسمی (مولانا مناظر احسن گیلانی)

۱۲۔ سوانح مولانا محمد قاسمؒ (مولانا محمد یعقوب نانوتوی)

۱۳۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی زندگی (مولانا عبید اللہ سندھی)

۱۴۔ علماء کا شاندار ماضی (مولانا محمد میاں۔ ناظم جمعیۃ العلمائے ہند)

(۱۵) فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)

۱۶۔ لائل محمڈنس (سر سید احمد خاں) (۱۷) مآثر صدیقی موسوم بہ سیرۃ والاجاہی (نواب صدیق حسن خاں)

۱۸۔ ماہنامہ تذکرہ دیوبند (اپریل ۱۹۶۲ء) (۱۹) مثنوی معنوی دفتر ہفتم (مولانا شیخ محمد تھانوی)

۲۰۔ مجدد الف ثانی کا نظریہ توحید (ڈاکٹر برہان احمد) (۲۱) نزہۃ الخواطر (مولانا عبد الحئی)

۲۲۔ نورِ محمدی (مولانا نسیم احمد علوی جھنجھانوی) (۲۳)

SOME ACCOUNT OF THE ADMINISTRATION OF INDIAN DISTRICTS DURING THE REVOLT OF BENGAL ARMY. — By Henry George Keene

تحقیق

وحدۃ الوجود والشہود

مع

حالات مصنف مولانا شیخ محمد تھانوی محدث

مرتبہ

ثناء الحق ایم۔اے (علیگ)

ناشر

پاک اکیڈمی (۱۴۱/۱ وحید آباد) گولیمار کراچی ۱۸